سلسلہ عصمت نمبر ۱۳۶

خیابانِ نسواں

از

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدر آبادی

جسے

بعد اخذ حق اشاعت دائمی

رازق الخیری مالک عصمت بکڈپو دہلی نے

محبوب المطابع دہلی میں چھپوا کر مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع کیا

بار اول　　　　قیمت ۱۲ر

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی تصانیف

آمنہ کا لال	عہ	گلدستۂ عید	۸ر	دُرِ شہوار	۸ر
سیدہ کا لال	عہ ۱۲ر	گرفتارِ قفس	۴ر	سات روحوں کے اعمالنامے	۸ر
الزہرا	۱۲ر	روداد قفس	۱۰ر	قرآنی قصے	عہ ر
عروس کربلا	عہ ۴ر	انگوٹھی کا راز	۶ر	عروس مشرق	۱۰ر
وداع خاتون	۵ر	تفسیر عصمت	۵ر	بزم رفتگان (با تصویر)	۱۰ر
شام زندگی	عہ ر	منظر اطلس	۵ر	گدڑی میں لعل	عہ ۴ر
صبح زندگی	عہ ۸ر	منازل ترقی	۴ر	نالۂ زار	۱۲ر
شب زندگی دو حصے	ع ۶ر	سیلاب اشک (با تصویر)	عہ	بے فکری کا آخری دن	۴ر
نوحۂ زندگی	۱۲ر	جوہر عصمت	عہ ۸ر	سیاحت ہند	عہ
محبوب خداوند	۱۲ر	نانی عشو	۱۰ر	گرداب حیات	عہ ر
نسوانی زندگی	۸ر	طوفانِ اشک	عہ ۴ر	دادا لال بجھکڑ	۸ر
طوفانِ حیات	عہ ر	سودائے نقد	۵ر	احکام نسواں	عہ ر
حیات صالحہ	عہ ر	ولایتی تنخی	۶ر	محسن حقیقی	۶ر
تمغۂ شیطانی	۱۲ر	بنت الوقت	۸ر	مسلی ہوئی پتیاں	۶ر
جوہر قدامت	عہ ۸ر	منازل السائرہ دو حصے	ع ۶ر	داستان پارینہ	۱۲ر
یاسمین شام	عہ ۴ر	بچہ کا کرتہ	۴ر	دُعائیں	۸ر
ستودہ	۸ر	امین کا دم واپسین	۴ر	چمنستانِ مغرب	عہ ر
غدر کی ماری شہزادیاں	۱۲ر	شہنشاہ کا فیصلہ	۴ر	بلبل بیمار	۱۰ر
ستونتی	۷ر	فسانۂ سعید	۸ر	یادگار تمدن	۶ر
قلب حزیں	۸ر	ویڈیا کی سرگذشت	۴ر	دلی کی آخری بہار	عہ ر
وداع ظفر (با تصویر)	عہ ۸ر	بہار عالم	۴ر	حور اور انسان	۱۲ر
تیغ کمال	عہ ر	شہید مغرب	عہ	نشیب و فراز	۴ر
بساط حیات	۶ر	سراب مغرب	۸ر	محصول ڈاک بذمہ خریدار	

حضرت علامہ مغفور کی یہ کتابیں نیز خواتین کے مطلب کی بہترین اردو کتب

دفتر عصمت کوچہ چیلان دہلی سے منگایئے

UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY; ALIGARH.
۳۳۰۸۹
M.A.LIBRARY, A.M.U.
U33089

انتساب

اس ناچیز تالیف

نہایت فخر و مباہات کے

حضرت شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ

کے اسم گرامی پر معنون کرنے کی عزت حاصل

کی جاتی ہے

نصیر الدین ہاشمی

CHECKED-2002

Ram Babu Saksena Collection.

فہرست مضامین

جملہ حقوق محفوظ

عصمت بک ڈپو دہلی

بار اول   مارچ ۱۹۳۸ء

عرض حال

میرے مضامین کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جو شائع ہو رہا ہے۔
اس مجموعہ میں وہ مضامین اکٹھے کیے گئے ہیں۔ جو خواتین سے متعلق ہیں
اس مجموعہ میں "خولہ بنت ازور" میرا پہلا مضمون ہے۔ جو آج سے ۲۱ برس
سال پہلے رسالہ "تاج (حیدرآباد) میں شائع ہوا تھا۔ "بادۂ کہن" جو تعلیم
نسواں سے متعلق ہے وہ بھی آج سے پندرہ سال پیشتر لکھا گیا تھا دوسرے
مضامین یورپ کی واپسی کے بعد گزشتہ سات سال کے عرصہ میں لکھے گئے
اور مختلف رسائل میں طبع ہوئے۔

"جوتے کی کہانی" کا مضمون اگرچہ بظاہر عورتوں سے متعلق نہیں ہے
مگر چونکہ اس میں یورپ کی معاشرت کے بعض نسوانی پہلو پیش کیے گئے ہیں۔ اس
لیے اس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

میرا یہ مجموعہ مضامین کسی دلچسپی کا موجب ثابت ہو تو اس کو محمد رازق الخیری
صاحب ایڈیٹر "عصمت" کی مہربانی کا نتیجہ سمجھا جائے۔ جنہوں نے براہ کرم
اس مجموعے کو شائع کرنے کا انتظام فرمایا۔

نصیر الدین ہاشمی

ستمبر ۳۶ء

پیش لفظ

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی ہستی دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے آپ ایک بلند پایہ صاحبِ قلم اور ملک کے قابل اور نامور ادیبوں میں سے مانے جاتے ہیں عصر جدید کے ممتاز و مخصوص نامہ نگاروں میں آپ کا شمار ہے خصوصاً طبقہ نسواں آپ کے پیہم رشحاتِ قلم کا رہینِ منت ہے مستورات کی زندگی کو سنوارنے کے لیے آپ نے مستند و بہترین معاشرتی و اصلاحی مضامین لکھے ہیں۔ پیش نظر کتاب انھیں منتشر مروارید کی ایک سلک ہے "خیابانِ نسواں" کی سیاحت سے خود اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا سیاح ایک ایسی سرزمین سے گزر رہا ہے جہاں مختلف قسم کے گل و بوٹے کھلے ہوتے ہیں قسم قسم کے مضامین کا یہ ادبی معاشرتی و اصلاحی مجموعہ آپ اپنا جواب ہے۔

"خواتین عہد عثمانی" صاحب موصوف کی کاوشوں کا ایک دل نشین و دلچسپ کارنامہ ہے جس میں آپ نے سرزمین دکن کی ان گمنام ہستیوں کو منظر عام پر لا کھڑا کیا ہے جن کو آج کئی قرن بھی گزر جاتے تو شاید ان سے دنیائے ادب لاعلم رہتی۔

کسی قوم کی یہ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس میں ایسے علم دوست باکمال اور مفکر افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جو اپنی محنت کاوش اور دلچسپی کا ثبوت دے کر اس قوم کے لٹریچر کو فروغ دیتے ہیں صاحب موصوف کی ادبی خدمات و افکارات عالیہ لائق ستایش ہیں غرضکہ اس ناچیز سے ہاشمی صاحب کی یہ توقع کہ زیر بحث مجموعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرے بمصداق نماک

میں کون ہوں؟ اور "تبصرہ" ہاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے!!

ج۔ نقوی بی۔ اے عثمانیہ ۱۴ مہر ۱۳۴۵ف

خولہ بنت ازور

اسلام میں صدہا شجیع اور بہادر عورتیں گزری ہیں۔ جن کا اگر مختصر حال بھی لکھیں تو ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ بعض ایسی محدث ہوئی ہیں جن کی نظیر نہیں۔ بعض ایسی ادیب ہوئی ہیں جن کا ثانی نہیں۔ بعض ایسی طبیب ہوئی ہیں جن کا جواب نہیں۔ بعض ایسی شجیع ہوئی ہیں جن کا کوئی ہم پلہ نہیں غرض کوئی علم وفن ایسا باقی نہیں رہا جن میں مستورات اسلام نے کمال نہ پیدا کیا ہو۔ اور نام آوری نہ حاصل کی ہو۔

ان ہی میں سے ایک خولہ بنت ازور ہیں۔ جن کا ذکر اگرچہ بہت سی کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میں ذیل میں صرف ایک جنگ کا حال لکھتا ہوں جن سے ان کی شجاعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جب صحابہ کرام نے شہر دمشق کا محاصرہ کیا اور دشمن اسلام رومی لڑائی سے عاجز ہوئے تو ہرقل (قیصر روم) نے ایک بڑی فوج محصورین کی امداد کے لیئے روانہ کی۔ جب امدادی فوج دمشق کے قریب آگئی تو صحابہ نے جن کے سردار خالدبن ولید تھے مشورہ کرکے ضراربن ازور کو ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ آنے والی فوج کے مقابلہ کے لیئے روانہ کیا۔ روم کے لشکر سے مقام بیت لیہیا میں مقابلہ ہوا۔ لشکر اسلام چونکہ بمقابلہ رومیوں کے بہت ہی کم تھا اس لیئے بہت بڑے معرکے کے بعد جس میں سردار لشکر روم کا لڑکا حمران بھی مارا گیا۔ ضرار گرفتار ہوگئے۔

جب خالد بن ولید کو یہ حال معلوم ہوا تو خود ایک لشکر لے کر مسلمانوں

کی امداد کو روانہ ہو گئے۔ ناگاہ خالد نے ایک سوار کو دیکھا جو ز سر تا پا لوہے میں غرق سوائے آنکھ کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا جس کی وضع قطع سے شجاعت ظاہر تھی بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے لشکر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ خالد متعجب ہوئے کہیں اس جوان کے نام سے ناواقف ہوں۔ غرض خالد اور لشکر اسلام نے اس سوار کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈالا اور روانہ ہوئے۔

رافع بن عمیرۃ الطائی جو ضرار کے بعد سردار لشکر ہوئے تھے بیان کیا ہے کہ ہم بڑے استقلال کے ساتھ دشمن سے مقابلہ کر رہے تھے ناگاہ خالد اور لشکر اسلام کو آتے ہوئے دیکھا۔ جن کے آگے ایک سوار نہایت تیزی کے ساتھ آ رہا تھا۔ غرض اس نے آتے ہی قلب لشکر روم میں گھس کر دائیں بائیں بہتوں کو مارا۔ رومیوں کی صفوں کو توڑ دیا۔ جب وہ سوار قلب سے باہر نکلا تو ہم نے دیکھا خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ رومی اس کی لڑائی سے ڈرنے لگے۔

لشکر اسلام نے اس سوار کا نام دریافت کیا۔ اس نے آوازِ دردناک آہستہ کہا میں خولہ بنت ازور ہوں۔ ضرار میرے بھائی ہیں۔ جب میں نے سنا کہ میرے بھائی گرفتار ہو گئے ہیں تو میں نے جوشِ محبت سے ان کے آزاد کرانے کے لئے یہاں آنا پسند کیا۔ لشکر اسلام کے بار بار اصرار پر میں نے اپنا نام اس وجہ سے ظاہر نہیں کیا کہ مجھ کو حیا و شرم مانع آتی تھی۔ خالد سن کر رو دئیے اور ان کو تسلی دی۔ اور لشکر اسلام نے ایک بار نہایت تیزی سے حملہ کیا۔ جس میں سب سے آگے خولہ ہی تھیں۔

خالد نے دیکھا کہ ایک جماعت روم کی خولہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ انہوں نے فوراً اُدھر حملہ کیا اور رومیوں کی زد سے انھیں بچا لیا۔ غرض مسلمانوں نے ایسا حملہ کیا جس سے رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

خولہ خون میں نہائی ہوئیں مثل ارغوانی پھول کے ہوگئی تھیں اور اُن کا گھوڑا پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ خولہ ہر ایک مسلمان سے اپنے بھائی کا حال دریافت کرتی تھیں جب اُن کو بھائی کا حال معلوم نہ ہوا تو ایسا روئیں کہ مسلمانوں کا دل ہل گیا اسی حال میں ایک جماعت اہل حمص کی امان کے لئے آئی اور خبر دی کہ ضرار کو ہرقل کے پاس روانہ کر دیا گیا ہے۔

خالد نے ضرار کو چھڑانے کے لئے سو سوار کے ساتھ رافع بن عمرہ طائی کو روانہ کیا جن کے ساتھ خولہ بھی تھیں وادی الحیوٰۃ میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا ضرار کو رومی اپنے بیچ میں گھیرے ہوئے تھے۔ لشکر اسلام نے تکبیر کہی اور حملہ کیا رومی ایک شخص بھی باقی نہ رہا سب کے سب قتل ہوئے۔ خولہ اپنے بھائی کو آزاد دیکھ کر نہایت خوش ہوئیں[۱]۔ یہ ہے اسلامی بہادری اور محبت

(رسالہ تاج حیدرآباد)
بابتہ ماہ مئی ۱۹۱۵ء

[۱] از فتوح الشام واقدی ۱۲

نامور خواتین دکن

دنیائے اسلام کے قطع نظر صرف ہندوستان کی نامور ہستیوں کے حالات کئی ضخیم کتابوں پر مشتمل ہوں گے۔ مگر یہاں ہم کو صرف اُن کا ذکر کرنا مقصود ہے جو دکن سے متعلق ہیں۔ دکن کے حصہ میں بھی بیسیوں ایسی ممتاز خواتین گزری ہیں جن کی بہادری اور دلاوری کے کارنامے تاریخ دکن میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ بیسیوں ایسی ہوئی ہیں جن کے تدبّر اور سیاست کے سکّے لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئے تھے۔ بیسیوں ایسی نظر آئیں گی جن کی قابلیت ولیاقت کے ڈنکے چاردانگ عالم میں بج گئے۔ بیسیوں ایسی ہوئیں جن کے جود وسخا کا شہرہ دُور دور تک پہنچا۔ غرضکہ نامور خواتین دکن کی مختلف صورتیں ہیں جن میں سے بعض تو عام طور سے مشہور و معروف ہیں مگر بعض ایسی مشہور نہیں ہیں جن سے عام طور پر ہماری نئی پود واقف ہو۔ اس لیے مختصر طور پر ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ حالات سلف سے با خبر رہیں۔

ملکہ جہاں حیات بی بی

دکن کی پہلی اسلامی سلطنت بہمنیہ ہے۔ جو ۷۴۸ھ ہجری میں قائم ہوئی اس کا بانی علاء الدین حسن بہمنی تھا۔ ملکہ جہاں حیات بی بی اسی کی ملکہ تھی۔ جس کے بطن سے محمد شاہ بہمنی جیسا دلاور بہادر لڑکا تولد ہوا۔

ملکہ اپنی جود وسخا کے باعث مشہور تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ایسی داد دہش کی کہ مدتوں تک اس کا ذکر ہوتا رہا۔ اس کی مختصر صراحت حسب ذیل ہے
ملکہ کو اپنے شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اس کے انتقال پر ایک سال تک

اپنا ذاتی روپیہ جواہرات اور جو کچھ مال و دولت تھا خیرات کر دیا۔ اور اس کے بعد مکہ معظمہ کو روانہ ہوئی۔ محمد شاہ نے جو کچھ خزانہ جمع کیا تھا یعنی چار سو من سونا اور سات سو من چاندی ساتھ کر دیا تاکہ وہاں خیرات کی جائے۔ ملکہ جہاں گلبرگہ سے روانہ ہوئی۔ صدر شریف اور معین خاں خواجہ سرائے ساتھ ہوئے۔ بندر دابل[۱] پر پہنچکر شاہی جہاز میں سوار ہوئے۔ ساتھیوں میں ہمراہین کے سوا آٹھ سو دوسری عورتیں بیوہ مساکین وغیرہ بھی ساتھ سوار ہوئے۔ جن کے پورے اخراجات ملکہ نے برداشت کئے۔ ایک ماہ سات دن کے سفر کے بعد وہ جدہ پہنچے۔ حج سے مشرف ہوئی مستحقین کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئیں اور یہاں ایک سال قیام کیا اور چار ہزار شادیاں اپنے صرفہ سے کرائیں۔ ہر روز خیرات کرتی تھیں۔ مدینہ سے جدہ روانہ ہونے سے پیشتر کربلا میں خیرات کرنے کے لئے کثیر رقم روانہ کی۔ جدہ سے دابل روانہ ہوئی یہاں خود سلطان محمد شاہ اس کے لڑکے نے پیشوائی کی۔ اس کے ساتھ عباسی خلیفہ المعتضد باللہ ابو الفتح (۷۵۳ھ تا ۷۶۳ھ) نے محمد شاہ کے لئے بادشاہی دکن کا فرمان خلعت اور خطبہ[۲] اور سکہ کی اجازت عطا فرمائی تھی۔ سلطان محمد شاہ بہمنی نے بڑی عزت کے ساتھ فرمان کو سر پر لیا۔ اور دو ماہ تک اس کی خوشی میں جلسے ہوتے رہے۔ اس کے بعد گلبرگہ کو واپسی ہوئی۔ ملکہ نے اپنے فرزند سے اجازت لے کر اپنے شوہر کی قبر کے قریب اپنے لئے ایک محل تیار کرایا۔ اور اس میں رہنے لگی۔ روزانہ صبح و شام قبر پر جاتی اور مفارقت پر گریہ و زاری کرتی۔ آخر کار ۷۶۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ شوہر کے پہلو میں دفن ہوئی۔

---

[۱] - یہ شہر سندھ میں تھا اب غیر معروف ہے [۲] زمانہ سابق میں اسلامی سلاطین کی خود مختاری کی علامت سکہ اور خطبہ میں نام لیا جاتا تھا اور جب تک عباسی خلفاء سے اس کی اجازت نہ ہو بادشاہی نامکمل تصور ہوتی تھی۔

مورخین گلبرگہ اس امر کو ملکہ کے حسنِ عقیدت اور خوبیٔ نیت قرار دیتے ہیں کہ مکہ معظمہ کے طویل سفر میں جو تقریباً دو سال تک رہا اور ایک ماہ سے زیادہ صرف جہاز میں بسر ہوا تھا اس پوری مدت میں ایک ہمراہی بھی فوت نہیں ہوا۔ جتنے اشخاص مرد و عورت بچے زیارت کے لیے گئے تھے وہ سب صحیح و سلامت واپس ہوئے۔

روح پرور آغا سلطان محمد شاہ بہمنی کی دختر اور مجاہد شاہ بہمنی کی حقیقی بہن تھی۔ تدبر اور سیاست میں شہرۂ آفاق تھی۔ اپنی قابلیت سے بھائی کے قاتل سے بدلہ لیا جس کی مختصر صراحت کی جاتی ہے

محمد شاہ بہمنی کی وفات پر اس کا لڑکا مجاہد شاہ تاج و تخت کا مالک بنا۔ تخت نشینی کے بعد بیجانگر کے راجہ سے مقابلہ ہوا۔ راجہ کو شکست ہوئی۔ اور مجاہد شاہ بندر رامیشور تک جا پہنچا۔ یہاں کافور کی تعمیر کردہ مسجد علائی کی مرمت کرائی۔

واپسی میں مجاہد شاہ کی آنکھ آشوب کر آئی تھی۔ وہ اپنے خیمہ میں سو رہا تھا۔ رات کے وقت داؤد خاں اس کا چچا چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ اس کے خیمہ میں گھس آیا۔ مجاہد شاہ کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا

روح پرور آغا اپنے بھائی کے بدلہ لینے کے درپے ہوئی۔ جب داؤد خاں محل میں آیا تو دوسری خواتین حرم کے ساتھ وہ مبارکباد کو نہ آئی۔ حرم میں روح پرور کی بڑی عزت تھی۔ داؤد شاہ نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا

روح پرور نے ایک شخص باکہ نام کو جو مجاہد شاہ کا مقرب خاص تھا ترغیب دی وہ شخص اپنی جان سے ہاتھ دھو کر مجاہد شاہ کا بدلہ لینے کو تیار ہو گیا چند ماہ کے بعد جب داؤد شاہ نماز جمعہ کے لیے مسجد گیا تو یہ شخص اس کے پیچھے

عقب میں نمازیوں میں شامل ہوگیا۔ جس وقت تمام نمازی سجدہ میں گئے تو اس نے داؤد پر وار کیا۔ اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہوگیا۔ داؤد شاہ کے عم زاد بھائی خان محمد نے اس وقت باکہ کو بھی قتل کر دیا۔

داؤد شاہ کا اگرچہ اس طرح نماز میں قتل ہونا قابل افسوس ہے مگر جب ہم اس کے قتل کو مجاہد شاہ کے ساتھ ملاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قتل کا بدلہ قتل سے ہوا جو روح پرور کا ایک کارنامہ ہے۔

(۳۲) نرگس خانم موسوم مخدومہ جہاں

ہمایوں شاہ بہمنی کی ملکہ تھی۔ اپنے تدبیر ولیاقت وسیاست کے باعث تاریخ دکن میں مشہور ہے۔ ہمایوں شاہ کے قتل کے بعد اس کا لڑکا نظام شاہ احمد شاہ ثالث کے لقب سے مسند حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ اس لئے اس کی ماں مخدومہ جہاں مختار کل بنی۔ اس نے اس وقت کے دو جلیل القدر امیروں یعنی خواجہ جہاں ترک اور ملک التجار محمود گاواں کو سلطنت کا کاروبار تفویض کیا۔ خواجہ جہاں کو منصب وکالت اور طرفداری صوبہ دارم "تلنگانہ" سے سرفراز کیا گیا۔ اور محمود گاواں کو جملۃ الملک کا خطاب اور طرفدار بیجاپور بنایا گیا۔

روز صبح کو یہ دونوں امیر آتے اور راہ بانو کی وساطت سے مخدومہ جہاں کی خدمت میں معاملات ملکی کو پیش کر کے حکم حاصل کرتے تھے۔ مخدومہ جہاں کی اس عقل مندی اور فراست کے باعث سلطنت کا کام نہایت عمدگی سے طے پانے لگا۔ اس طرح اگرچہ اندرونی معاملات عمدگی سے طے پاتے تھے۔ مگر بیرونی گرد و نواح کے والیان ملک نے جب دیکھا کہ خورد سالی

لڑکا تختِ حکومت پر جلوہ گر ہے تو ان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اور سب سے پہلے اڑلیسہ کے راجہ نے چڑھائی کی۔ راج بندری سے ہوتے ہوئے کولاس تک آ پہنچے۔ مخدومہ جہاں نے باتفاق و مشورہ خواجہ جہاں و محمود گاواں کو ۴۰ ہزار سواروں کے ساتھ خود نظام شاہ کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ بادشاہ کو فتح ہوئی اور راجہ اڑلیسہ رات کے وقت میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

اس کے بعد محمود شاہ خلجی والی مالوہ نے دکن پر فوج کشی کی۔ اس کے ساتھ اڑلیسہ اور تلنگانہ کے زمیندار بھی شریک ہو گئے۔ اور قلمرو بہمنیہ میں لوٹ مار مچادی۔ ایسے نازک وقت میں بھی مخدومہ جہاں ہمت نہ ہاری۔ ایک حصہ فوج کو تلنگانہ کے زمینداروں کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ اور نظام شاہ کے ہمراہ محمود شاہ پر حملہ کیا گیا۔ قندھار کے قریب مقابلہ ہوا۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑے حصہ پر محمود شاہ قابض ہو گیا۔

اب مخدومہ جہاں نے محمود شاہ گجراتی سے امداد طلب کی اور وہ اسی ہزار سوار کے ساتھ سرحد دکن پر آیا۔ اور ایک بڑی فوج محمود شاہ خلجی کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئی۔ محمود شاہ نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ دکن کو چھوڑ کر اپنے ملک کو چلا جائے۔ مگر دوسرے سال پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ بھی شاہ گجرات نے مدد دی اور اس کی سعی سے ہمیشہ کے لیے صلح ہو گئی

اس کے بعد نظام شاہ کی شادی ہوئی۔ مگر شادی کی رات کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اب مخدومہ جہاں نے اس کے دوسرے بھائی محمد کو جو ۹ سال کا تھا تخت نشین کیا۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے صدر جہاں شوستری کو مقرر کیا گیا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ خاندان بہمنیہ میں محمد شاہ کی قابلیت فیروز شاہ کے بعد سب سے بڑھی ہوئی تھی۔

محمود گاواں اور خواجہ جہاں میں اول تو بنی رہی ۔مگر اب خواجہ جہاں نے ہاتھ پیر نکالے ۔اور محمود گاواں کو ہمیشہ سلطنت سے دور رکھنے لگا ۔ اور اپنے لوگوں کو ترقی دینے لگا ۔تو مخدومہ جہاں اس گُر کو سمجھ گئی اور ایسا موقع نہ آنے دیا کہ اس سے سلطنت کو نقصان پہنچتا ۔نہایت ہوشیاری کے ساتھ خواجہ جہاں قتل کر دیا گیا ۔اور ایسا انتظام کیا گیا کہ کوئی فتنہ برپا نہ ہو ۔اب محمود گاواں کو خواجہ جہاں کا خطاب دیا گیا ۔اور امیر الامرائی کے ساتھ منصب وکالت بھی ملا اس کے بعد چودہ سال کی عمر میں محمد شاہ کو کاروبار سلطنت دیکر خود علیحدہ ہو گئی ۔مگر محمد شاہ نے اس کی زندگی تک کوئی کام اس کے مشورے کے بغیر نہیں کیا ۔

محمود گاواں دکن کا مشہور وزیر ہے ۔جس کے کارنامے تاریخ دکن میں ہمیشہ تاباں و درخشاں رہیں گے ۔اس کے قائم کردہ مدرسے محمود گاواں کے کھنڈر بیدر میں اب تک اپنے بانی کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔اور زبان حال سے گویا ہیں کہ اس کا بانی تعلیم سے کیسی ہمدردی رکھتا تھا ۔

۱۴۷۲ء میں محمد شاہ نے گوا پر حملہ کیا ۔وہ شرنگ کے ذریعہ فتح کیا گیا اس حملہ کے وقت بھی مخدومہ جہاں ساتھ تھی ۔واپسی میں اس کا انتقال ہو گیا

مخدومہ جہاں ہی کا طفیل تھا کہ خاندان بہمنیہ میں کچھ اور مدت تک سلطنت باقی رہ گئی ۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں اس کا عروج ہوا ۔اس کے تدبر اور لیاقت سے بڑے بڑے اہم کام آسان ہو گئے اور بیرونی حملہ کے باوجود سلطنت ترقی کرتی رہی بڑی بڑی جنگوں میں شریک ہوئی اور فتحیاب ہوئی ۔

جس طرح وہ میدان جنگ میں کامیاب رہی اس طرح وہ میدان سیاست میں سرآمد روزگار تھی ۔اس کی قابلیت اور دوربینی سے بڑے بڑے فتنوں کا قبل از قبل انسداد ہو گیا اور سلطنت بہمنیہ خانہ جنگیوں سے محفوظ اور مامون رہی ۔ (رسالہ عصمت)

بیجاپور کی ایک نامور ملکہ کی علمی سرپرستی

بیجاپور کی مشہور ملکہ چاند سلطانہ کے کارنامے تاریخ دکن کے اوراق پر جلی حروف میں نظر آتے ہیں۔ آج ہم بیجاپور کی ایک دوسری ملکہ کے علمی کارنامے پیش کرتے ہیں۔ یہ نامور ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو عرف حاجی بڑے صاحب ہے۔

خدیجہ سلطانہ سلطان محمد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ تا سنہ ۱۰۳۵ھ) کی دختر اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ) کی بہن تھی۔ سلطان محمد عادل شاہ (سنہ ۱۰۳۷ھ تا سنہ ۱۰۶۷ھ) کی ملکہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۳۷ھ) کی بہو تھی۔

ملکہ کے تولد کا صحیح سنہ معلوم نہیں۔ سنہ ۱۰۴۲ھ میں اس کی شادی ہوئی اور یہ شادی سلاطین بیجاپور او گولکنڈہ کے سلسلہ اتحاد اور قرابت کی ایک دوسری کڑی تھی۔ کیونکہ اس کے پہلے ابراہیم عادل شاہ کی شادی محمد قلی قطب شاہ کی ہمشیرہ سے ہو چکی تھی۔

شادی کی تحریک کا بانی خواص خاں تھا جو اپنے پیش رو دلاور خاں کے اصول کے مدنظر قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں تجدید اتحاد اور

اتفاق کو ضروری تصور کرتا تھا۔ کیونکہ مغلوں کے حملوں سے بیجاپور کو محفوظ رکھنے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے تنہا سلطنت عادل شاہی کافی نہیں تھی۔ بلکہ کسی اور امداد اور معاونت کی شدید ضرورت تھی۔

خواص خاں ایک زبردست مدبر تھا۔ اس نے پچھلے رشتہ کو مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اولاً شیخ دبیر کو سفیر کر کے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہاں اس نے شاہ ابوالحسن (سفیر عادل شاہی متعین گولکنڈہ) کے ذریعہ سلطان کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ ایک مہینہ کی گفت و شنید کے بعد قطب شاہ نے اس رشتہ کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد محمد عادل شاہ کی جانب سے مراری پنڈت اور عنبر خاں حبشی گولکنڈہ کو آئے۔ جب یہ سرحد قطب شاہی پر پہنچے تو سلطنت کی جانب سے نہ صرف ان کا استقبال کیا گیا۔ بلکہ منزل بہ منزل ان کی پیشوائی کے لئے امرائے دربار قطب شاہی آتے رہے۔ کریم خاں سرنوبت میرزا حمزہ اپنی جمعیت کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نصیر الملک نے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر استقبال کیا اس کے بعد شاہی غلام ملک عنبر ملک آدم۔ ملک الماس یکے بعد دیگرے پیشوائی کے لئے آتے رہے۔ آخر پر فصیح الدین محمد نے استقبال کیا۔ تعظیم اور تکریم کے ساتھ معزز مہمانوں کو دامن کوہ طور[۵۱] میں اتارا گیا۔

۱۹ شعبان ۱۰۴۲ھ کو شادی کا آغاز ہوا۔ اس روز سلطان محمد عادل شاہ کی ہمشیرہ جو دلہن کو لینے آئی تھی خواتین حرم کے ساتھ لباس اور لوازم عروسی کو دو ہزار کشتیوں میں ترتیب دے کر دلہن کے قصر کو روانہ ہوئی یہ محل ندی کے کنارے قصر ندی سے موسوم تھا۔ اور شادی کیلئے خاص طور پر آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ ۲۵ شعبان کو قاضی بلدہ نے

۵۱۔ کوہ طور کے نام سے کون پہاڑ موسوم تھا صحیح معلوم نہیں ہے۔

بڑی مجلس میں عقد باندھا۔ چونکہ دولھا موجود نہیں تھا۔ اس لیے وکالتاً ایجاب وقبول ہوا۔ تیس لاکھ ہون مہر مقرر ہوا۔ دوسرے دن رخصتی ہوئی بڑے بڑے امرائے قطب شاہی دولھن کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ جو ملازمین دولھن کے ساتھ جانے والے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف خادماؤں کی ستّر پالکیاں تھیں جس میں بیس پالکی خاصہ کی اور چالیس پالکی عام تھیں۔ سامان جہیز میں علاوہ دیگر اشیاء کے صدہا فیلان کوہ پیکر اسپان ترکی وتازی اور اشتران قوی ہیکل شامل تھے۔ کل سامان جہیز کی قیمت پانچ لاکھ ہون بیان کی جاتی ہے۔ شادی کی تقریب میں ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں پچاس ہزار ہون خرچ کیے گئے۔

وسط رمضان میں دولھے والے حیدرآباد سے بیجاپور کی جانب روانہ ہوئے قطب شاہی سرحد پار ہو کر جب گلبرگہ میں یہ قافلہ پہنچا تو عادل شاہی سلطنت کی جانب سے اخلاص خاں نے چار ہزار سوار کے ساتھ استقبال کیا اور جب دولھن بیجاپور سے ایک منزل پر پہنچی تو مصطفےٰ خاں اور خواص خاں استقبال کے لیے آئے۔ دولھن کی جانب سے میر فصیح الدین نے ان کی دعوت کی اور سلطان عبداللہ کی جانب سے خلعت اور تحائف دیئے گئے دوسرے دن خود دولھا سلطان محمد عادل شاہ اپنی دولھن کو لینے کے لیے آیا۔ شہزادی کے خیموں کے قریب سلطان کے خیمے نصب کیے گئے۔ جلوہ کی رسم ادا ہوئی۔ آخر شب کو دولھا دولھن کو لے کر اپنے محل کو روانہ ہوا۔

ایک مہینہ تک بیجاپور میں شادی کے جلسے ہوتے رہے۔ اس کے بعد دولھن کے ساتھ والوں کو خلعت انعام واکرام دیکر رخصت کیا گیا۔

خافی خاں نے سہواً اس شادی کو بجائے محمد عادل شاہ کے علی عادل شاہ

سے منسوب کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بیجاپور کے سب مورّخ محمد عادل شاہ سے متفق ہیں۔

خدیجہ سلطان ذی علم اور شعر و شاعری کا خاص ذوق رکھتی تھی۔ اس کے باپ دادا بھائی سب علم دوست اور علم پرور بادشاہ تھے۔ اس کا ماحول تمام تر علمی تھا۔

علی عادل شاہ کی تعلیم و تربیت خدیجہ سلطان کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ علی کا علمی ذوق اور علمی سرپرستی اس کی ماں کی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا۔ اسی لڑکپن کے علمی و ادبی ماحول کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر وہ اپنے زمانہ کا نامور سلطان اور باکمال شاعر ہوا اور بیجاپور اس کے علمی ذوق کی بدولت شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔

خدیجہ سلطان کو علمی شغف ورثاً عطا ہوا تھا کیونکہ محمد قطب شاہ جیسا علم دوست اور علم پرور بادشاہ اس کا بھائی تھا۔ اور پھر شادی کے بعد بھی اس کو علمی و ادبی فضا ملی۔ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کا قائم کیا ہوا علمی ماحول وہاں موجود تھا۔ اور محمد عادل شاہ جیسا علم پرور شوہر اس کو ملا تھا۔ ان وجوہ سے خدیجہ سلطان کی علمی قابلیت میں اور چار چاند لگ گئے اور اس کی عمدہ تربیت سے علی عادل شاہ متمتع ہوا۔

مؤلف "اُردو شہ پارے" کی رائے سے ہم کو کامل اتفاق ہے کہ "بیجاپور میں ادب اُردو کا بہترین دور اس جلیل القدر ملکہ کا ممنونِ احسان ہے جس نے عرصہ دراز تک سلطنت عادل شاہی کی ادبی اور سیاسی کارروائیوں میں زبردست حصہ لیا...... اور خاص طور پر عالموں اور ادیبوں کی سرپرست ثابت ہوئی۔" صفحہ ۴۳

افسوس ہے کہ ہم کو اس علم پرور ملکہ کے علمی کارناموں کی پوری تفصیل معلوم نہیں۔ مگر جو علمی کارنامے موجود ہیں وہ بھی اس کے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے اور اردو کے محسنوں میں نمایاں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔

بیجاپور کا مشہور شاعر ملک خوشنود اسی ملکہ کا غلام تھا۔ اس کے قصائد اور مثنویاں مشہور تھے۔ مگر سر دست دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی (۱) یوسف زلیخا[1] (۲) ہشت بہشت

اول الذکر اگرچہ نایاب ہے۔ مگر ہشت بہشت کے اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ملک خوشنود نے ہشت بہشت کے پہلے یوسف زلیخا کی تصنیف کی تھی۔

"ہشت بہشت" کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ یہ کتاب

---

[1] رسالہ اردو میں ہماری کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" پر جہاں اور بھی بے سروپا الزام لگائے ہیں وہاں اس امر کی بھی تنقیص کی گئی ہے کہ ملک خوشنود کی کوئی تصنیف "یوسف زلیخا" نہیں تھی۔

معلوم ہوتا ہو نقاد صاحب کی نگاہ سے ملک خوشنود کی "ہشت بہشت" یا کم از کم وہ اشعار جو یوسف زلیخا کی تصنیف کے متعلق ہیں نہیں گزرے ورنہ ایسی جرأت نہ کیجاتی یورپ کی مثنوی میں وہ اشعار موجود ہیں جن سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک خوشنود نے یوسف زلیخا کی تصنیف کی ہے ہمارے اس بیان کی تائید ڈاکٹر زور کی رائے سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ "اردو شہ پارے" میں انھوں نے لکھا ہے:-

"فی الوقت اسکی دو مثنویوں کا ہمیں پتہ چلا ہے۔ "یوسف زلیخا" اور "ہشت بہشت" اور یہ دونوں غالباً خسرو کی انھیں ناموں کی مثنویوں کے ترجمے ہیں۔

اگرچہ امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا دکھنی ترجمہ ہے۔ مگر اس کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک نادرالکلام اور کہنہ مشق شاعر تھا۔

خوشنود کی شاعری کی شہرت خدیجہ سلطان کے باعث ہوئی۔ ملکہ اس کی اعلیٰ قابلیت اور علمی ترقی کا ذریعہ بھی ملکہ ہی تھی۔ ملکہ کی سرپرستی کے باعث وہ غلامی کے زمرہ سے نکل کر اعلیٰ مدارج پر فائز ہوا۔ اور دکھنی شاعری میں اپنا نام پیدا کیا۔

خوشنود نہ صرف شاعری کی حیثیت سے ممتاز ہوا بلکہ بیجاپور کے شاہی سفیر کی حیثیت سے گولکنڈہ کے دربار کو روانہ کیا گیا جہاں اس کی خوب قدر و منزلت ہوئی۔ اور کامیابی کے ساتھ اپنے کام سے واپس آیا[5]۔ غرض کہ اس کی شہرت اور قابلیت کا دارومدار خدیجہ سلطان پر ہی تھا۔ جس کی سرپرستی اور نوازش کے باعث اس کو عروج ہوا۔ اور ملکہ کی یہ سرپرستی خوشنود کی اعلیٰ لیاقت اور شاعری کی وجہ سے تھی۔

خوشنود کی یہ مثنوی ہشت بہشت ۱۰۵۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں حمد و نعت اور معراج کے بیان کے بعد بادشاہ کی مدح کی گئی ہے اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

اس نامور ملکہ کی دوسری علمی یادگار "خاور نامہ" دکھنی ہے۔ یہ ابنِ حسام کے فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے جو چوبیس ہزار اشعار پر ختم ہوا ہے۔ یہ رزمیہ مثنوی اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث اردو کی واحد مثنوی ہے۔ اس مثنوی کے

---

[5] خواص خاں جس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے خودسر ہو گیا تھا۔ اپنی چالبازی سے تمام امورِ ملکی و مالی پر قابض تھا۔ بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی اس کی خودسری سے نجات پانے کے لئے عبداللہ قطب شاہ سے مدد طلب کی گئی تھی۔ ملک خوشنود اس سفارت پر روانہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گولکنڈہ کا مشہور شاعر خواصی بھی بیجاپور آیا تھا۔

بعض خصوصیات یہ ہیں
(الف) اوّل تو یہ دکھنی زبان کی سب سے پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔
(ب) دوسرے یہ کہ ضخامت کے لحاظ سے بھی پہلی مثنوی ہے
(اس کے بعد صرف ایک دو مثنویاں اس قدر طویل لکھی گئی ہیں۔
(ج) طویل ہونے کے باوجود مضمون مسلسل قائم ہے۔
(د) اکثر اشعار اس قدر صاف ہیں کہ وہ بجائے نظم کے نثر معلوم ہوتے
ہیں۔ یہ قابل تعریف مثنوی اسی ملکہ کے حکم سے لکھی گئی ہے۔ عام طور سے یہ اعلان
کردیا گیا تھا کہ جو شاعر اس کام کو انجام دے گا وہ نہ صرف نوازشات شاہانہ
سے سرفراز کیا جائے گا بلکہ سب سے بڑا شاعر بھی تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ
اس کے متعلق جو دیباچہ لکھا گیا ہے اس میں بھی اس کا ذکر ہے جستہ جستہ
اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سبب منظوم کردن خاور نامہ دکھنی این بود کہ علیا جناب خورشید
نقاب قدر افواستے دیہیم عفت ....
خدیجہ سلطان شہر بانو المقلب بڑے صاحب .... رحہین
بخاطر رسید کہ خاور نامہ فارسی۔ اگر بزبان دکھنی منظوم شود بہتر است
پس فرمو ندہرکہ ایں کتاب خاور نامہ را بزبان دکھنی منظوم کنند
اورا بمراحم گونا گوں شاہانہ دعواطف بوقلموں خسروانہ ممتاز فرمودہ
از ابنائے زمان سخنوران دوراں سرفراز گردانیم"

اس رزمیہ مثنوی کا مصنف کمال خاں رستمی ہے۔ جو سات پشت سے عادل
شاہی حکومت کے دامن دولت سے وابستہ تھا۔ شاہی خوشنویسوں کے
زمرہ میں داخل تھا خطاط خاں خطاب عطا ہوا تھا۔

رستمی اپنے زمانہ کا نامور ادیب اور شاعر تھا نہ صرف دکھنی میں۔ بلکہ فارسی شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ غزلیات اور قصاید منظوم کیے تھے۔ مگر افسوس اب ناپید ہیں۔ صرف یہی ایک مثنوی اس کی یادگار ہے۔ جو اس کی قابلیت کی بین دلیل ہے۔ چوبیس ہزار شعر کی طویل مسلسل مثنوی کا۔ صرف ڈیڑھ سال کے قلیل عرصہ میں قلمبند کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

یہ مثنوی ۱۰۵۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ جو بالتصویر ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے۔ ہندوستان میں جہاں تک میری معلومات ہیں کوئی نسخہ نہیں ہے۔

ایک اور بات اس مثنوی سے یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ مثنوی ملکہ کے خاص ایماء اور حکم سے لکھی گئی اور اس کی تصنیف پر یقیناً شاعر مال و دولت سے سرفراز کیا گیا ہوگا۔ مگر اس میں ملکہ کی یا بادشاہ کی مدح نہیں ہے حالانکہ یہ دکھنی مثنویوں کا تقریباً عام قاعدہ رہا ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ مثنوی دکھنی مثنویوں میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے اور اپنے خصوصیات کے باعث قابل قدر ہے۔ یہ مثنوی اسی ملکہ کی علمی سرپرستی اور فیاضی کی بدولت مرتب ہوئی ہے۔

غرض کہ ملکہ کی سرپرستی اور علمی قدر دانی سخن فہمی اور سخن سنجی بیجاپور میں مشہور و معروف تھی۔ بڑے بڑے علما وقت اور اعلے درجہ کے شعرا اور ادیب اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

اس کی ہر دلعزیزی کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ جب علی عادل شاہ کے زمانہ میں وہ حج کو جانے لگی تو بیجاپور کے تمام شعرا نے نہایت خلوص سے تاریخیں اور قصاید لکھے۔

افسوس ہے کہ اس علم دوست ملکہ کا سنہ انتقال بھی معلوم نہیں۔ مگر یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے علی عادل شاہ ثانی متوفی ۱۰۸۳ھ کے زمانہ میں حج کو گئی اور واپسی کے بعد انتقال ہوا۔

چاند سلطانہ جس طرح اپنے جنگی کارناموں سے "تاریخ دکن" میں مشہور و معروف ہے۔ اسی طرح خدیجہ سلطان اپنے علمی کارناموں کے باعث زندہ جاوید رہے گی۔

(رسالہ شہاب حیدرآباد)

ایک دکھنی مرثیہ گو شاعرہ

یہ امر مسلّمہ ہے کہ اردو کو ادبی عزّت دکن نے بخشی۔ دکن اس امر پر جائز فخر کر سکتا ہے کہ اُردو نظم و نثر کی ابتدا کا سہرا اسی کو حاصل ہے۔ جہاں تک تحقیقات ہوئی ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اُردو میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے اولاً مسلسل نظم (مثنوی) کا رواج ہوا۔ اگرچہ اب تک قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کی بیسیوں مثنویوں کا پتہ چل چکا ہے۔ مگر نہیں معلوم اور کتنے شاہ پارے گوشۂ گمنامی میں پوشیدہ ہیں

دکن کی اسلامی سلطنتوں میں ہر طرف علمی و ادبی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر گھر شعر و سخن کا چرچا تھا۔ مشاعرہ کے جلسے ہوتے تھے۔ مجالس میلاد اور مجالس عزا کا خاص دستور تھا۔

مجلس عزا میں اولاً تو محتشم کاشی کے بند پڑھے جاتے تھے۔ مگر بہت جلد دکھنی مرثیے لکھے جانے لگے اس کی ابتدا کا سہرا بھی دکھن ہی کو حاصل ہے۔

قطب شاہی (گولکنڈہ) اور عادل شاہی (بیجاپور) عہد کے متعدد مرثیہ گو شعرا اور اُن کے بیسیوں مرثیے دستیاب ہو چکے ہیں۔ جو اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

اگرچہ مجھے اب تک سترہویں صدی عیسوی کی کسی دکھنی شاعرہ کا کلام دستیاب نہیں ہوا ہے۔ مگر بعض تاریخوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے۔ اس زمانہ کی خواتین بھی شعر کہا کرتی تھیں۔ دکھن کی پہلی شاعرہ جس کا کلام موجود ہے وہ ماہ لقا بائی چندا ہے۔ اس کا دیوان کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے سوا

انڈیا آفس کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ جو سر جان ملکم کو بطور نذر دیا گیا تھا۔

چندا کا دیوان ۱۲۲۶ھ میں مرتب ہوا ہے۔ چونکہ اس پر متعدد مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ اس لئے مزید کسی صراحت کی ضرورت نہیں معلوم نہیں ہوتی۔

آج ہم ایک دکھنی شاعرہ کا مرثیہ پیش کرتے ہیں۔ جس کا نام شرف النساء تھا۔ اور یہی تخلص بھی کرتی تھی۔ یہ کون تھی؟ کس زمانہ میں تھی؟ اس کے کیا حالات ہیں؟ ان پر سر دست کوئی روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

اس کا مرثیہ جس بیاض سے دستیاب ہوا ہے وہ اپنی اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے سنہ ۱۲ھ کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔ شرف النسا کے کلام کے مد نظر اس کو سنہ ۱۱ھ کے اواخر کی مرثیہ گو کہا جا سکتا ہے۔

دکھنی مرثیوں کی خاص بات ان کا مرثیہ پن ہے۔ ان کے مطالعہ سے صاف طور پر پایا جاتا ہے۔ ان کا مقصد غم حسین پر آنسو بہانا ہے۔ شرف النسا کا مرثیہ کوئی طویل مرثیہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف آٹھ شعر ہیں۔

دسیا چاند غم کا گگن میں حسین　　پڑیا زلزلہ سب زمن میں حسین
رسالت کے گھن کا منور چندر　　چھپا کربلا کے رن میں حسین
شہاں کا شہنشاہ سرور حسین　　ہے مہمان کربل کے رن میں حسین
کیے کیوں ستم شہ اوپر ظالماں　　اکیلے رہے جب او رن میں حسین
ولایت کے گلشن کا گل غم سیتی　　پڑیا جھڑ جنت کے چمن میں حسین
کیا کہن نے نیلی قبا تن اوپر　　دکھیا جب اکیلا صحن میں حسین
جدا ہو کو جب خانداں سوں سکھو　　رہیا چلو مرجا کے تن میں حسین

یو روتی ہے شرف النسأ غم سیتی

یہی حیف کہا اپنے من میں حسین

کہتی ہے کہ آسمان پر غم کا چاند نظر آیا۔ زمین پر زلزلہ پڑ گیا۔ رسالت کے گھر کا چاند کربلا میں پوشیدہ ہو گیا۔ بادشاہوں کا بادشاہ میدان کربلا میں مہمان ہے۔ ظالموں نے جب حسینؑ کو میدان میں تنہا پایا۔ تو اس پر ظلم کرنے لگے۔ گلشن ولایت کا پھول جھڑ گیا۔ حسینؑ کو جب اکیلا دیکھا تو چرخ نے نیلی قبا زیب تن کی۔ اسی غم میں شرف النساء بھی روتی ہے۔

اگرچہ ادبی حیثیت سے اس کو کوئی اعلیٰ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ مگر جس طرح صاف اور سادہ الفاظ میں ماتم حسینؑ میں آنسو بہائے ہیں وہ ضرور قابل لحاظ ہیں

(رسالہ عصمت)

حیدرآباد کی ایک شاعرہ

ہم ذیل میں ایک حیدرآبادی شاعرہ کا تعارف کراتے ہیں امید ہے کہ موجب دلچسپی ہو

حیدرآباد کی اس مشہور شاعرہ کا نام نوشابہ خاتون قریشیہ ہے۔ اور نوشابہ تخلص کرتی ہیں۔ آپ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت سب کچھ حیدرآباد میں ہوئی ہے قبل اس کے کہ آپ کی شاعری کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ اولاً آپ کے مختصر حالات کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ آپ کی تعلیم و تربیت علمی شوق۔ مطالعہ کا ذوق سب کچھ قابل تقلید ہے۔

نوشابہ خاتون صاحبہ کے والد ماجد مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) ہیں۔ جو نائب صدر ناظم کوتوالی اضلاع سرکار عالی تھے اور اب وظیفہ حسن خدمت پاتے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کی دیانت۔ جفاکشی۔ مستعدی سررشتہ کوتوالی میں مشہور و معروف تھی۔ آپ کے والد محمد امین حسین تھے۔ جن کو بہادر شاہ ظفر کی سرکار میں بخشی فوج کا عہدہ سرفراز تھا۔ غدر کے بعد انگریزی فوج میں اسسٹنٹ سرجن کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ڈاکٹری کے سلسلے میں آپ کو حکمت میں بھی دخل تھا۔ اپنے وقت کے حکیم حاذق تھے۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور انگریزی کے بھی ماہر تھے۔ آپ کے اجداد ہندوستان کے پہلے اسلامی فاتح محمد بن قاسم کے ہمراہ آئے تھے۔

تعلیم و تربیت۔ نوشابہ خاتون کی تعلیم خانگی طور سے گھر پر ہوئی اور اسی تعلیم سے انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

ان کی تعلیمی مشکلات اور موانعات کے ساتھ حصول علم کے ذوق و شوق کا مختصر بیان بھی نامناسب نہیں ہے۔ کیونکہ صنف نازک کے لئے یہ نہ صرف باعثِ تقلید ہے بلکہ ان کا بیان ان بہنوں کے لیے محرک اور حوصلہ افزا ثابت ہوسکتا ہے۔ جنہیں عہد حاضرہ کی تمام سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں۔

چوتھے سال آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اپنی والدہ کے پاس کلام مجید اردو اور ریاضی کی تعلیم شروع کی۔ چھ سال کے عرصہ میں نہ صرف کلام مجید ختم کرلیا بلکہ اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا بھی آگیا۔ ساتویں سال فارسی کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ مطالعہ کے شوق نے والد کے کتب خانے کی کتابیں ختم کرادیں۔ نو سال کی عمر سے آپ کو فرضی افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ دس سال کے سن میں آپ کی تعلیم ایک عرصہ کے لئے منقطع ہوگئی کیونکہ آپ کی والدہ اعلیٰ تعلیم کی حامی نہیں تھیں۔ مگر علم کی شوقین نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ کئی وقت کے فاقہ سے جب ناتوانی اور ضعف آگیا تو پھر تعلیم کی اجازت ملی اور پس پردہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ تعلیم عربی۔ انگریزی تاریخ جغرافیہ اور ریاضی پر مشتمل تھی۔ مگر آپ کی تعلیم مسلسل نہیں ہوئی۔ بلکہ درمیان میں کئی ماہ کا وقفہ ہوتا گیا۔ اس طرح سرکار عالی کے امتحان مولوی میں کامیابی حاصل کی۔ اور پھر صرف چار ماہ کی قلیل مدت میں عثمانیہ میٹرک میں کامیابی حاصل کرلی۔ انگریزی میں بہت زیادہ نمبر حاصل کرنے کے علاوہ دینیات میں سب سے اول آئیں۔ جس کی بنیاد پر سرکار عالی سے آپ کو ایک سو روپیہ کا تعلیمی وظیفہ جاری ہوا تاکہ خانگی طور پر آپ اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ کیونکہ اُس وقت تک جامعہ عثمانیہ سے متعلق کلیہ اناث قائم نہیں ہوا تھا۔

اب آپ کی تعلیم باقاعدہ شروع ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں آپ نے ایف۔ اے

اور سنہ ۱۹۲۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس تعلیم کے زمانہ میں امورِ خانہ داری بھی آپ سے متعلق تھے۔ اکثر اوقات تمام تمام رات مطالعہ ہوا کرتا۔

اس تفصیل سے آپ کی تعلیم اور علمی شوق کا بخوبی علم ہو سکتا ہے۔ اگر باقاعدہ تعلیم ہوتی اور کلیہ اثاث موجود ہوتا۔ تو نہ معلوم کس قدر جلد آپ تعلیم سے فارغ ہو جاتیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ کی شادی ہوئی اور ایک صاحبِ قلم انہیں زندگی ملا۔

شاعری۔ دس سال کی عمر سے آپ کو شاعری کا شوق ہے۔ اس کا آپ کو فطرتی شوق تھا۔ کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی شاعری چمکنے لگی۔ بارہ سال کی عمر میں جو غزل آپ نے کہی اس کے بعض شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

کہیں کس سے بھلا بتلا دُ تو دردِ نہاں اپنا
مٹایا ہم نے ہی جبکہ ہے خود نام و نشاں اپنا

فلک کو گالیاں دیں اور کئے تقدیر کے شکوے
زباں خاموش ہوتی ہے نہ تھکتا ہے دہاں اپنا

نہ تو کچھ علم ہی سیکھا نہ کچھ عزت ہی حاصل کی
ہمیں کیوں کر رہا مدہوش ہے خوابِ گراں اپنا

چمن اجڑا شجر کاٹے گئے ایسی خزاں آئی
مگر ہے بے خبر ہے اس حال سے کیوں باغباں اپنا

قسم اللہ کی تو شاید بری ہے قوم کی حالت
جب ہی تو لگئی وحشت سے سب آرام جاں اپنا

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے آپ کو شاعری کا خاص مذاق حاصل ہے اور کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔ اس لئے آپ "تلمذ الرحمان" کہی جا سکتی ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں آپ طبع آزمائی کرتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً آپ کا کلام مختلف رسالوں مثلاً:۔ عصمت۔ شبابِ اردو۔ ترقی۔ النساء۔ سہیلی۔ تہذیبِ نسواں۔ ہمجولی وغیرہ رسالوں میں شائع ہوتا اور خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا ہے۔

آپ کے کلام سے شاعری کے محاسن کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے

بیاں کی خوبی۔طرز ادا کی ندرت خیالات کی پرواز۔زبان کی صفائی اور سادگی سب کچھ آپ کے کلام میں موجود ہیں۔

شروع سے آپ کو قومی اور ملکی شاعری سے ذوق رہا ہے۔ ہر وقت قوم کا درد دکھ۔اس کی تباہ حالت کا مرثیہ آپ کے ورد زبان رہا۔چونکہ بچپن سے اخبارات کا بڑا شوق تھا۔قوم کی پستی مسلمانوں کے زوال اور درماندگی کے حالات آپ کو خون کے آنسو رلانے تھے۔انھیں خیالات اور جذبات کا اظہار آپ کے کلام میں ہونے لگا۔

آپ کے کلام کا بڑا حصہ قومی درد والم سوز و گداز سے مملو ہے مختلف نظموں کے علاوہ جو خاصی طویل ہیں۔غزلوں میں بھی آپ نے اسی قوم کی پستی پر اظہار افسوس کیا ہے۔اگرچہ آپ کا کلام اب تک شائع نہیں ہوا ہے مگر جو کچھ شائع ہوا وہ ہمارے دعوے کی تائید کے لئے کافی ہے۔مختصر طور پر آپ کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔خلافت کے جلسوں میں آپ کی کئی نظمیں سنائی گئیں۔اور خراج تحسین حاصل کیں۔جن میں سے ایک مرثیہ غم کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔جو درحقیقت غم والم کی سچی داستان ہے۔اس کے سننے والوں نے اپنے آہ وبکا سے صف ماتم قائم کی تھی۔دوسری نظم مرقع بسمل کے نام سے لکھی گئی تھی۔یہ نظم بھی درحقیقت ایک مرقع ہے۔جس میں خون دل سے مصوری کی گئی ہے۔وہ کونسی آنکھ ہے جو اس کے سننے کے بعد اشک بار نہ ہو جائے۔اور وہ کونسا دل ہے جو موم نہ بن جائے۔
بطور نمونہ مرقع بسمل کے چند بند پیش ہیں۔

آہ اے آفت زدہ مجروح ومظلوم وستم — آہ اے تصویر حسرت اے مجسم درد وغم
اے اسیر صد مصیبت اے گرفتار الم — یعنی وہ لاچار جس کا ہے لقب خیرالامم

زور و طاقت مٹ گئی دم خم گیا کس بل چلا
اے مریضِ نیم جاں کیوں تیرا منکا ڈھل چلا

مسلمِ بیکس تری وہ شان و شوکت مٹ گئی
ظلم کا چرچا ہوا حق کی حمایت مٹ گئی

سلطنت جاتی رہی افسوس طاقت مٹ گئی
ہائے کس منہ سے کہوں یارب خلافت مٹ گئی

ہے ہجوم جور بیجا امن اسلام پر
برقِ آفت گر نہ جائے خرمنِ اسلام پر

فلسفہ تسکین انسانی کا باطل ہو گیا
ہائے اطمینان ہستی اب تو مشکل ہو گیا

مسلم مظلوم و بیکس ہائے بسمل ہو گیا
آہ پورا آج شوقِ مشقِ قاتل ہو گیا

عقل و حکمت سلب کر لی ترکِ آلام نے
کر دیا برباد یارب گردشِ ایام نے

اے مسلمانو اگر سچی حمیت تم میں ہے
جوشِ قومی حب قومی درد قومی تم میں ہے

پاس ایماں اور اسلامی اخوت تم میں ہے
غیرتِ دیں کا تقاضائے اطاعت تم میں ہے

پیروی گر چاہتے ہو احمد ذی جاہ کی
بندگی منظور ہے کرنی اگر اللہ کی

خوف کھانے کی ضرورت کیا ہے پھر اغیار سے
ہے تملق ناپسندیدہ بہت اشرار سے

حق پرستی کی اگر ترغیب و گفتار سے
چاہئے ثابت کرو اطوار سے رفتار سے

بھائیو لو کام کچھ تو ہمت و ایثار سے
مضطرب ہو کر نہ ہٹنا جادۂ دشوار سے

عاقبت کی فکر ہو جس دل میں وہ دل خوب ہے
دور اندیشی بھی اللہ کو مرغوب ہے

گر رضائے رب باری بھائیو مطلوب ہے
ہستیٔ مسلم اگر اسلام سے منسوب ہے

ہو سرِ تسلیم خم بہر رضائے ذوالجلال
ہے یہی نوشابہ ناشاد بس فکرِ مآل

نوشابہ خاتون صاحبہ کے کلام کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے اور اس میں بھی قوم اور ملک کے متعلق توجہ کی گئی ہے۔ دنیا اور اہل دنیا۔ اخلاق انسانی زندگی وغیرہ امور پر آپ کی کئی نظمیں ہیں اور کئی نظمیں نیچرل شاعری سے متعلق ہیں۔ سب کا انتخاب طوالت کا موجب ہوگا۔ بعض اور نظموں کا مختصر نمونہ پیش ہے۔

انجام کارِ ہستی

دیکھو بچشمِ عبرت انجام کارِ ہستی — باقی ہیں زندگی کے لیل و نہارِ ہستی
آبادیوں میں پنہاں بربادیوں کی علت — لایا خزاں کی آمد دورِ بہارِ ہستی
ہے ورطۂ ہلاکت بحرِ لقائے عالم — سمجھے ہوئے ہیں جس کو دارالقرارِ ہستی
صہبائے کیف آور دوروزہ زندگی ہے — ترشی چکھی قضا کی اُترا خمارِ ہستی
ایک اک قدم پہ کانٹے لاکھوں کھچے ہوئے ہیں — ہے لالہ زارِ دنیا ایک خارزارِ ہستی
تیری حیات فانی دیکھی نظر فریبی — دل سے نکل چکا ہے بالکل وقارِ ہستی
آیا تھا اس جہاں میں کیوں رہروِ عدم تو — کیا لے چلا جہاں سے اے داغدارِ ہستی
میدان میں عمل کے ہو کچھ تو گام فرسا — کچھ نقش چھوڑتا جا ہاں یادگارِ ہستی
علم و عمل کی وسعت محتاجِ حوصلہ ہے — سمجھو بساطِ کوشش ہے کارزارِ ہستی
زادِ معاد کی جو کچھ جستجو نہیں ہے — کیا بن گئے جہاں میں جاگیردارِ ہستی
ربِ جلیل تیری ہی ذات لم یزل ہے — ہے لازوال تو ہی اے کردگارِ ہستی
یارب کہیں ٹھکانے لگ جائے خاک میری — اڑتی پھرے فضا میں مشتِ غبارِ ہستی
ہستی نشانِ قضا کا تو شانۂ حزیں ہے — گر ہے اجل پیامِ ختمِ بہارِ ہستی

اس نظم میں جس طرح صاف اور واضح طور پر ہستی کی شرح کی گئی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس کارزارِ عالم میں لاکھوں کروڑوں انسان آئے مگر بتاؤ کس کا نام و نشان باقی ہے؟ کون زندگی جاوید کا مالک ہے؟ روز و شب گزر جاتے۔ دن اور ہفتے چلے جاتے۔ ماہ و سال ختم ہو جاتے ہیں۔ جو آج ہے وہ کل نہیں ہے۔ جو کل ہے پرسوں اس کا نشان نہیں۔ انسانی زندگی دو روزہ ہے۔ یہاں اسی کا نام و نشان رہ جاتا ہے۔ جس نے میدان

عمل میں کوئی کام کیا ہے - اپنا کوئی نقش چھوڑا ہے - دنیا دار القرار نہیں بلکہ دار الفنا ہے - اگر اس کارزارِ عالم میں کسی کا نام باقی رہ سکتا ہے تو صرف

میدان میں عمل کے ہو کچھ تو کام فرسا
کچھ نقش چھوڑ تا جایاں یادگار ہستی

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ نوشابہ کی شاعری میں نیچرل شاعری بھی ہے فطرتی اشیاء کے ترجمانی بھی خوب کی گئی ہے - اس سے آپ کے وصف نگاری کے کمال کی اچھی وضاحت ہوتی ہے دہلی کی گرمی پر آپ کی ایک مختصر نظم ہے - اس میں گرمی کی شدت اور لو کی تپس کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے

عجیب خط ہے یہ خدایا زمین آتش اگل رہی ہے
ہے شہر دہلی عرب کا صحرا سموم ہر وقت چل رہی ہے
تنور ہے یا کہ گرم بھٹی کہ جان جس میں پگھل رہی ہے
تپش ہے کیسی کہ ہر بن مو آنچ یا رب نکل رہی ہے
ہوا نہیں ہے یہ لو کا لوکا یہ شعلۂ آتشیں غضب ہے
کہ جس کے جھونکوں سے روحِ انساں بری طرح آہ جل رہی ہے
پڑے ہیں یاں خاک چھانتے جی ہی ہی تو موت کا انتظار کیسا
تن حزیں پہ آگھی یہ گرد مونگ چھاتی پہ دل رہی ہے
ہوئی جو شب آئی تازہ آفت کہ سر بسر خاک ہو گئے ہم
ہوا کا جھکڑ ہے یا کہ آندھی بلا کوئی یا کہ چل رہی ہے
زمیں سے تا آسماں خدایا غبار ہی کا ہے ابر چھایا
فلک سے گرد و دھول چھن رہی ہے زمین مٹی اگل رہی ہے
نہالِ نخلِ حیات یہ دھوپ یا رب جلا رہی ہے
تمازتِ آفتابِ ہستی کی کونپلوں کو مسل رہی ہے

(عصمت)

ایک نظم سری نگر (کشمیر) کے شالامار باغ کے منظر پر لکھی ہے - اس کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں -

فرش زمیں زمردیں نیلگوں چتر آسماں
موج ہوا ہے عنبریں قطعہ ہے سارا بوستاں
قلعہ کو ہسار برف
منظر پُر بہار برف
کیوں نہ ہو آبدار برف
یاں ہے گہر نثار برف

قدرتِ کردگار ہے ذرہ خاک سے عیاں — ظاہر و آشکار ہے شانِ خدائے دوجہاں
باغ و راغ گل بدوش — قوت نامیہ بجوش
ساری زمیں ہے سبزہ پوش — دامنِ کوہ گلفروش
رنگ شفق سے لالہ گوں چرخ کا دل ہوا ہے خوں — نور سپہر ہے فزوں چادر آب سیم گوں
باندھے ہوئے ہیں صف قطار — سرو کہیں کہیں چنار
بید کہیں ہیں سایہ دار — سیب کہیں کہیں انار
تازگی بخش ہے فضا اور سماں نشاط روح — موج ہوا وہ دلفزا جس سے ہوا انبساط روح
نغمہ سرا ہیں یا ہزار — گونج رہے ہیں سبزہ زار
جھوم رہے ہیں شاخسار — مست ہیں سارے جانور
نقرئی جوئبار ہے سیم گوں آبشار ہے — منظر پر بہار ہے رحمتِ کردگار ہے
نکہتِ گل سے عطربار — دشت و جبل ہیں لالہ زار
در و دمن کی ہے بہار — قدرتِ حق ہے آشکار
روح فزا نسیم ہے پھیلی ہوئی شمیم ہے — فضل خدا عمیم ہے خطہ یہی نعیم ہے

(عصمت)

نوشابہ خاتون کی شاعری میں غزلوں کا ذخیرہ کم ہے۔ مگر جو کچھ ہے وہ تعریف کے قابل ہے۔ کیونکہ ان کی غزلیں حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہیں، انھوں نے اپنی غزلوں میں نعت۔ تصوف۔ حقیقت و معرفت۔ فلسفہ و حکمت کو بیان کیا ہے۔ قدیم طریقہ کی عشق و عاشقی۔ محبت و وصال ساقی و ساغر گل و بلبل کے افسانے نہیں ہیں

ان کی غزلوں سے بلندی خیال اور رنگینی مضمون۔ صفائی زبان انداز و بیان کی ندرت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ پھر وہ اثر میں ڈوبی ہوتی ہیں یہاں صرف

دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں :-

روضۂ پاک میں حسرت رہی مدفن ہوتا
گر مدینہ نہ تھا قسمت میں کہ مسکن ہوتا

ہوتی جاروب کشی مرقدِ انور کی نصیب
کاش ظلمت کدۂ ہند نہ مدفن ہوتا

سایۂ گنبدِ خضرا جو مجھے مل جاتا
طائرِ روح کا طوبے پہ نشیمن ہوتا

پرتوِ فیضِ رسالت کی جھلک پڑ جاتی
یہ سیہ خانۂ دل کاش کہ روشن ہوتا

پیروی سنتِ نبوی کی میسر ہوتی
داغِ دل پھر تو مرا لالۂ گلشن ہوتا

پھول میں رحمتِ باری کے سحد پر کھلتے
لالہ و گل نہ کہیں سنبل و سوسن ہوتا

غم و آلام ستاتے نہ مجھے نوشابہ
خطۂ پاک مرا مادر و مامن ہوتا

سنہ ۱۹۳۰ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے سالانہ مشاعرہ میں ذیل کا مصرعہ طرح دیا گیا تھا :-

"ہے جنوں تیرا نیا ، پیدا نیا ویرانہ کر"

اس پر نوشابہ خاتون نے حسب ذیل غزل لکھی تھی :-

ہے جنوں تیرا نیا ، پیدا نیا ویرانہ کر
وقفِ جولانی خدارا نجد کا صحرا نہ کر

قصۂ پارینہ ہے عہدِ وفا کی داستاں
بیوفائی کا مرتب دہر میں افسانہ کر

یاد رکھ ساحل پہ موجیں ہی تجھے پہنچائیں گی
بحرِ ہستی میں کبھی طوفان کی پروا نہ کر

جستجو ہے شاہدِ مقصود ہے گر ہم نشیں
موت کی پروا نہ کر کچھ ہمتِ مردانہ کر

کوششوں پر منحصر ہے کامیابی جب تری
پھر مقدر کا گلہ اور چرخ کا شکوہ نہ کر

ہیں جنوں سامانیاں تمہیدِ اسرارِ خرد
کچھ تو سعیِ ہوشمندی اے دلِ دیوانہ کر

پھونک دے سرگرمیِ روحِ عمل ہر ذرہ میں
انجماد افسردگی کا قلب میں پیدا نہ کر

فتنۂ خوابیدہ جاگ اٹھے نہ اے سرو ناز
چال سے اپنی قیامت دہر میں برپا نہ کر

اگرچہ یہ نوشابہ خاتون کی شاعری کا مختصر تذکرہ ہے ۔ مگر اس سے بھی آپ کی شاعری کی بخوبی وضاحت ہوسکتی ہے اور معلوم ہوسکتا ہے کہ دکن میں صنفِ قوی کے ساتھ صنفِ نازک بھی ترقی کے میدان میں جولاں ہیں نوشابہ خاتون کو تعلیم کے ختم کے بعد اپنی ہم جنس بہنوں کی خدمت گزاری کا اچھا موقع مل گیا۔ اور کلیہ اناث میں پروفیسری کی خدمت پر آپ کا تقرر ہوچکا تھا مگر افسوس آپ کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے جس کے باعث آپ پوری طرح خدمت گزاری سے مجبور ہیں ۔ اسی طرح دنیوی افکار اور خانگی مصروفیت اس امر کا موقع نہیں دیتے کہ شاعری کے میدان میں پوری جدوجہد کے ساتھ مصروف رہیں ۔ اور اپنے دماغی افکار سے باغ اردو کی آبیاری کریں اور رنگ برنگ کے پھول چمنستان اردو میں لگائیں ۔ چنانچہ آج بھی ان کی صحت اچھی نہیں ہے اور وطن سے کوسوں دُور ہیں ۔

دعا ہے کہ خدا انھیں صحت کلی عطا فرمائے اور وہ اپنی شاعری سے گلشن اُردو میں خوشنما گل بوٹے لگائیں ۔ فقط

(رسالہ زیب النساء)

بادۂ کہن

جنسِ نازک کو تعلیم کی کیوں ضرورت ہے؟

مخالفینِ تعلیم نسواں کا یہ پہلا سوال ہوتا ہے۔ اس کا جواب مذہبی اور تمدنی لحاظ سے دینا ضروری ہے قبل اس کے کہ کسی ایک حصہ سے بحث کی جائے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مختصر طور پر تعلیم نسواں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ تعلیم نسواں کا جواز۔ کیا بہ لحاظ مذہب اور کیا بہ لحاظ تمدن اپنی تاریخ کے ساتھ ملزوم ہے۔

تاریخ اگر ہم ابتدائے تعلیم نسواں کی تحقیقات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سے حضرت انسان کا وجود عمل میں آیا اور ان کی تعلیم بارگاہ صمدیت سے ہوئی اسی وقت جنسِ نازک کو بھی اس نعمت عظمیٰ میں برابر کا شریک اور حصہ دار کیا گیا۔ جس طرح حضرت آدم کو ہر ایک شے کے نام سے آگاہی بخشی گئی اور انھیں اشرف المخلوقات کا خطاب عطا ہوا۔ اسی وقت حضرت حوا کو بھی تعلیم دی گئی اور آگاہی بخشی گئی اس کے بعد جس وقت حضرت آدم کی خطا معاف کرنے کا وقت آیا اور انھیں اپنی مغفرت کے لیے رب العزت سے ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین والی دعا کی تعلیم ہوئی۔ تو اس میں حضرت حوا بھی برابر کی شریک نظر آرہی ہیں۔ کیونکہ صرف مرد کی تعلیم مقصود ہوتی تو ضمیر واحد مذکر کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پس اس سے صاف عیاں ہے کہ جس وقت مرد کی تعلیم ہوئی

اس وقت ان کی شریک زندگی کو بھی اس سے محروم نہ کیا گیا۔

آدم کے بعد دنیا کی قدیم متمدن سلطنتیں مصر۔ بابل۔ ایران ہندوستان میں بھی عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری و لازمی سمجھا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان ممالک میں خواتین جہانبانی کے رتبہ تک پہنچ گئیں۔ بابل کی ملکہ تو یہاں تک اولوالعزم تھی کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک پر بھی حملہ کیا اور ایران کے فرماں روایاں پوران دخت آرزمی دخت سے ہمارے کان ناآشنا نہیں ہیں جنھوں نے نہایت ہی نازک زمانہ میں جب کہ شیرازۂ سلطنت منتشر ہو رہا تھا سلطنت کو سنبھالا۔ اس طرح ارض مقدس۔ یونان۔ روما۔ ہندوستان کی بہت ساری تعلیم یافتہ خواتین اگرپنیا ایملا سنتھا۔ جزبیل۔ رحمت۔ حنا۔ لیلاوتی۔ وغیرہ مشہور ہیں۔ چنانچہ حنا کی شاعری کا ثبوت انجیل سے ملتا ہے۔ جزبیل مردوں کی طرح پبلک امور میں حصہ لیتی تھیں۔ لیلاوتی ہندوستان کی بہت بڑی ریاضی داں تھی۔

جس طرح ان ممالک میں تعلیم نسواں کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور حکمرانی میں ان کو حصہ دیا گیا ہے اسی طرح ملک عرب کی بھی حالت تھی۔ ملکہ بلقیس کے نام سے کون واقف نہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی زوجہ محترمہ تھیں۔ یہ در اصل ملک عرب کے خطۂ یمن کی نامور فرماں روا گزری ہیں۔

عرب کی خطابت اور شاعری مشہور ہے جس میں ان کو بجا ناز تھا۔ اسی طرح علم ادب میں خواتین کا نام بھی یہیں جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند خواتین کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو فصیح و بلیغ شاعرہ

تھیں اور جن کا لوہا عرب مانتے تھے۔

آمنہ۔ عتبہ بن حارث کی لڑکی۔ اخت النضر۔ اروی۔ اسما۔ امامہ تماضر۔ عتبیہ۔ حبیبہ بن عبد العزیٰ۔ خدام وغیرہم۔ ان میں سے بعض کا کلام حماسہ میں درج ہے۔ جس سے ان کی فصاحت و بلاغت کا کامل ثبوت ملتا ہے۔ عبد المطلب کی کل لڑکیاں شاعرہ تھیں۔ ہر ایک نے باپ کی فرمائش پران کے نزع کے وقت مرثیے کہے ہیں۔ جو شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ہند بنت عتبہ جو ابوسفیان کی زوجہ اور معاویہ کی ماں تھیں اپنی فصاحت اور حاضر جوابی کے باعث مشہور ہیں۔ چنانچہ ان کی حاضر جوابی کا ثبوت اس گفتگو سے بخوبی ملتا ہے جو آنحضرت صلعم سے بیعت کے وقت ہوئی تھی۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰ جن کا اسلام پر احسان عظیم ہے فصیح و بلیغ شاعرہ تھیں۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تعلیم نسواں کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا۔ اور اس پر عمل ہوا ہے۔ چنانچہ بی بی عائشہ صدیقہؓ (جن کی پرورش زمانہ اسلام ہی میں ہوئی) کا نام اسلام کی ابتدائی تاریخ میں سنہری حرفوں سے نظر آتا ہے۔ جو نہ صرف علم حدیث و فقہ سے واقف تھیں۔ بلکہ علم ادب۔ تاریخ اور طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپ کا مکان علمی انجمن کا مرکز تھا۔ جہاں بڑے بڑے علمی مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے ممبر حضرت علی۔ زید بن ثابت۔ عبد اللہ بن عباس۔ عبد اللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر اصحاب تھے۔

آپ کی ہمشیرہ بی بی اسمار (زبیر بن العوام کی بانوئے محترم) بھی اسی طرح مختلف علوم میں دخل رکھتی تھیں۔ ام المومنین بی بی حفصہ بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ آنحضرت نے ان کو ارشاد فرمایا تھا کہ تم فلاں صحابیہ سے کتابت کیوں

نہیں سیکھتیں۔ اسی طرح بی بی فاطمۃ الزہرا علوم مروجہ میں ید
ان کے علاوہ کئی صحابیہ مشہور ہیں۔ جن کے کارنامے
آج تک مشہور ہیں۔ مثلاً :۔ ام اسنان (بنی لیث)
اسماء بنت یزید اشہلی یہ طلاقت لسان میں شہرۂ آفاق تھیں۔ انھوں نے
آنحضرت کے پاس وفد کی جانب سے تقریر کی۔ امامہ قبیلہ زبید کی مشہور شاعرہ
تھی۔ خنساجریر نے اس کو اشعر الشعرا کہا ہے۔ اور اسی طرح نابغہ نے اس کو
کل شاعروں سے افضل کہا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی بہت ساری
فصیح و بلیغ شاعرہ۔ محدثہ۔ اور فقیہہ کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً حفصہ بنت عبدالرحمن
بن ابی بکر صدیق بہت بڑی محدثہ تھیں۔ ابن ثابت اور ابن بابک نے روایت
کی ہے کہ سودۃ الہمدانیہ حضرت علی کی طرفدار تھیں معاویہ سے بہت اچھی بحث کی ہے
ام حکیم بنت قارظ عبیداللہ ابن عباس کی زوجہ نہایت بلیغ شاعرہ ہوئی
ہیں۔ اپنے دو چھوٹے لڑکوں کا مرثیہ کہا ہے۔ جن کو معاویہ نے قتل کرایا تھا
اس مرثیہ کے سننے کا اس قدر اثر ہوا کہ ایک شخص نے قاتل کے دو لڑکوں کو
قتل کر دیا۔

جب بنو امیہ اور بنی عباس کے زمانہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا
ہے کہ اس زمانہ میں بھی تعلیم نسواں کا عام طور پر دستور تھا اور یہی وجہ تھی کہ بہت
ساری خواتین ادب۔ فقہ۔ حدیث۔ صرف و نحو۔ ریاضی۔ طب اور موسیقی
وغیرہ میں مشہور ہوئی ہیں۔ مثلاً

فن حدیث

آسیہ بنت صالح — سیوطی نے شاگردی کی ہے۔

ام عمر بنت حافظ تقی الدین — ابن حجر عسقلانی نے اجازت روایت حاصل کی ہے۔

عمرۃ بنت عبدالرحمن بن } بہت سے تابعین
سعد بن زرارہ } نے علم حدیث حاصل
کیا ہے
زینب سیوطی نے شاگردی کی ہے
زینب بنت احمد کمال الدین خطیب بغدادی
اور ابی القاسم الہمدانی
نے شاگردی کی ہے
عائشہ بنت مسلم حرانی مشہور محدثہ
فاطمہ بنت احمد الحسینی سیوطی نے شاگردی کی ہے
حمدۃ بغدادی علم حدیث پر لکچر
دیا کرتی تھیں۔
علامہ ابن سمعانی نے
اجازت زدا حاصل کی ہے

فقہ

زینب ام المؤید خلافت عباسیہ
سے اجازت درس
حاصل تھا۔

صرف و نحو

ام ہانی علامہ سیف الدین } نحو۔ فقہ حدیث
کی ماں } میں یگانہ دہر تھیں
سیوطی نے شاگردی کی ہے

بنت الکنیزی نحو لغت میں ید طولی
رکھتی تھیں کئی کتابوں
کی مصنفہ ہیں۔
عروضہ ابو المطرف } صرف و نحو۔ معانی
عبدالرحمن کی لونڈی } بدیع فقہ میں یگانہ
دہر تھی۔ علم لغات اور
نحو اپنے آقا سے حاصل
کیا۔ لیکن استاد پر فوقیت
لے گئی۔

ادب شاعری

امامہ خلیفہ واثق باللہ کے
عہد کی مشہور جادو بیان
شاعرہ تھی۔
شبینہ جمیل کی معشوقہ مشہور
شاعرہ
حمدۃ غرناطہ کے ایک کتب فروش
کی لڑکی۔ نہایت قابل
شاعرہ تھی۔
ام الخیر بنت حمیداللہ } معاویہ کے زمانہ
غسانی } میں حاضر جواب
شاعرہ تھی۔

خدیجہ ہارون رشید کی بہن	فصیح و بلیغ شاعرہ تھی۔
زبیدہ رشید کی بی بی	امین کا دردناک مرثیہ لکھا ہے
زینب	غرناطہ کے کتب فروش زید کی لڑکی نہایت اعلیٰ شاعرہ اور تمام علوم مروجہ میں ماہر تھی
عائشہ	قرطبہ کے ایک شخص احمد کی بیٹی۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ اندلس کی عورتوں میں کوئی شریف عورت علم و فن شعر و ادب میں اس باکمال کے پایہ کی نہ تھی وہ اندلس کے بادشاہ سے بیدھڑک بات کرتی اشعار فی البدیہہ کہتی
صفیہ	اشبیلیہ کی مشہور خاتون فصیح اور بلیغ شاعرہ اور خوشنویس بھی تھی۔
لیلیٰ خیلیہ	عرب کے مشہور شاعر توبہ کی معشوقہ خلیفہ عبدالملک کی شان میں نہایت پرمغز پاکیزہ قصائد لکھا کرتی تھی۔
خدیجہ بنت القیم بغدادی	کتابت اور قرأت حدیث میں یگانہ دہر تھی دمشق میں مدتوں ان علوم کا درس دیا ہے۔ اسی طرح ادبیات میں خاص امتیاز حاصل تھا مقامات حریری کی تشریح ایسی عمدہ کرتی تھی کہ بڑے بڑے ادبا نے اس سے اس کتاب کو پڑھا ہے

طبابت

بنت زہر محمد بن عبدالملک کی بیٹی	۵۹۶ھ میں فن طبابت میں یکتائے زمانہ تھی امیر منصور کے محلات کا علاج کیا کرتی تھی۔

ریاضی

فاطمہ حسن بن محمد بن حسن — یحییٰ ابرکی کی بی بی حساب اور منطق میں بہت دخل تھا۔

کتابت

فاطمہ حسن بن علی العطار کی بیٹی — فن کتابت میں یہ رتبہ حاصل کیا تھا کہ اس وقت کے جملہ کاتبوں نے اسی کی تقلید اختیار کی تھی غیر ممالک کے صلحنامے اسی سے لکھائے جاتے

جاریۃ الناصر — ناصر لدین اللہ خلیفہ عباسی کی لونڈی کتابت میں نہایت اعلیٰ پایہ تھا۔ خلیفہ کے خط کی بعینہ نقل کرتی تھی۔

عائشہ — قاضی علاء الدین حنبلی کی بیٹی محدثہ اور اعلیٰ درجہ کی خوشنویس تھی

موسیقی

عزۃ المیلا — مدینہ منورہ کی اعلیٰ درجہ کی موسیقی داں تھی اس نے کئی ایک راگ ایجاد کئے تھے

لکچرار

جوہرہ — ہبتہ اللہ بن حسن کی بیٹی بغداد کی مشہور لکچرار تھی

مندرجہ بالا کسی ایک فن یا دو فن میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتی تھیں اب چند ان خواتین کے نام پیش کئے جاتے ہیں جو اس وقت کے جملہ علوم و فنون میں یکتائے زمانہ ہوئی ہیں۔

سکینہ بنت الحسینؑ — علاوہ علوم مروجہ میں ماہر ہونے کے بہت بڑی لکچرار تھیں۔ آپ کے لیکچر نہایت فصیح و بلیغ ہوتے تھے کوفہ کی جامع مسجد میں آپ اکثر لکچر دیا کرتیں۔ سامعین کا ہجوم ہوا کرتا جس میں علمائے وقت شرکت کو فخر تصور کرتے تھے۔

امۃ الجلیل بڑی باخدا اور عارفہ تھیں۔ علمائے وقت نے ولایت کے معنی پر بحث کرتے ہوئے آخر فیصلہ ان سے طلب کیا

امۃ الرحمٰن حجاج بن یوسف کی زوجہ نہایت عالمہ فاضلہ تھی، حجاج کا بیان ہے کہ میری رات اس کے ساتھ ایسی گزرتی تھی جیسے کسی عالم کی علماء و فقہا کی مجلس میں

امۃ الخبیر بغداد کی ایک نامی گرامی فاضلہ تھی بڑے بڑے علمائے وقت سے علم حاصل کیا خود تدریس پر کمر ہمت باندھی اسماعیل ابن عساکر قاضی تقی الدین سلیمان ابن سعد وغیرہ محدثین نے ان سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

فاطمہ الحکم اندلسی کی حرم تھی صرف و نحو ادب حساب اور باقی کل علوم مروجہ سے آگاہ تھی۔ علاوہ اس کے اعلیٰ درجہ کی انشا پرداز تھی جس کی وجہ سے حکم کے پاس نہایت عزت تھی۔ حکم کی جانب سے فرامین لکھا کرتی جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں وقت اس سے بہتر کوئی مرد اور نہ کوئی عورت انشا پرداز تھی

نفیسہ دمشقی ابوالفرج کی بیٹی علوم متداولہ میں کامل دسترس تھا۔ علم حدیث میں اس کو یہ فروغ تھا کہ بارہا لیکچر دیتی تھی اس کی مجلس درس میں سامعین کا ہجوم رہتا تھا شاعرانہ مناظرہ کرتی تھی ۵۷۹ھ میں اس کا انتقال ہوا اس نے

ملک منظفر تقی الدین
کی تعریف میں قصیدہ
حمزیہ لکھا تھا۔ اس کے
بعد قصیدہ حربیہ لکھا
جس میں لڑائی کے
نکات وغیرہ بیان
کئے تھے۔

خیزران — ہاروں اور ہادی کی
ماں نہایت عاقل اور
فاضلہ تھی امور مملکت
میں یحییٰ برمکی کو مدد دیا
کرتی تھیں۔

زینب بنت ابو القاسم عبدالرحمٰن — بہ لحاظ اپنی فضیلت کے
علمائے عہد کے ہم پلہ تھی

صفیہ اندلسی — عبدالرحمٰن ثالث کے
عہد میں یہ فاضلہ علوم
مروجہ سے آگاہ اور
نہایت خوشنویس تھی
اس کے اشعار نہایت
سلیس اور معانی ہوتے تھے
جن کو خلیفہ سن کر محظوظ ہوتا

مریم — ابو یعقوب انصاری کی بیٹی
اشبیلیہ میں رہا کرتی تھی
شہر مذکور میں درس دیا کرتی
معانی بیان بدیع۔ شعر ادب
میں یگانہ زمانہ تھی اس کے
شاگردوں کی بہت قدر
کی جاتی۔

ام الفضل — مامون کی بیٹی علوم مروجہ میں
ید طولیٰ رکھتی تھی

عائشہ — خلیفہ معتصم عباسی کی بیٹی کا
اُس عہد کے علماء و فضلا میں
شمار ہوتا تھا

عائشہ — قاضی القضاۃ شہاب الدین
کی بیٹی علوم مروجہ میں کمال پیدا کیا
تھا امام سیوطی نے اپنے اُستادوں
میں اُنکا نام لکھا ہے

فاطمہ — علامہ علیم الدین نیرانی کی عالم و
فاضل بیٹی صلاح الدین نے
شاگردی کی ہے

طوالت کے خوف سے میں عہد
سلجوقی کو بیان کرسکتا ہوں اور نہ

کسی اسلامی دور کو بلکہ صرف ہندوستان پر سرسری نظر ڈال کر اصل مضمون کو بیان کرونگا۔

ہندوستان و دکن کی تاریخ میں رضیہ سلطانہ، چاند سلطانہ۔ خدیجہ سلطانہ کے نام جلی حرفوں میں نظر آتے ہیں جو جہاں بانی وغیرہ میں اپنا آپ نظیر تھیں۔ بابر کی نورِ نظر گلبدن بیگم کی لیاقت ہمایوں نامہ سے اور عالمگیر کی لختِ جگر زیب النسا بیگم کی اس کے اشعار سے روشن ہے۔ نورجہاں بیگم سے کوئی ناواقف نہیں ہے ان ناموں کے قطع نظر اگر ہم ایک صدی پیشتر کے جنوبی ہند (علاقہ مدراس) پر نظر ڈالیں جبکہ وہاں کے علماء کی مذہبی پاسداری تعصب کی حد تک پہنچ گئی تھی علم کلام کی تعلیم سخت گناہ کبیرہ خیال کی جاتی تھی اور عورتیں تو درکنار مردوں کو بھی اس تعلیم سے بہرہ مند ہونے کی قطعی ممانعت تھی تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک محترم خاتون اس علم کو حاصل کر کے اس میں کمال حاصل کرتی اور اپنے لڑکے کو خود ہی تعلیم دیتی ہے اور یہ لڑکا آگے چل کر ایک سلطنت کا وزیر ہوتا ہے۔ اسی سے خیال کیا جاسکتا ہے تمام ہندوستان میں تعلیم کا کہاں تک رواج تھا۔ اگر آج کل کی طرح تعلیم نسواں کی محافظت ہوتی تو ہمیں صرف شاعرہ خواتین کے صدہا نام نہ نظر آتے۔ جو اُردو کی سرتاج کہی جاسکتی ہیں۔ مثلاً اختر دہلی کی شہزادی۔ اختر محل بیگم۔ اسیر امیر بیگم۔ بدیہہ گو۔ میر محمد تقی میر کی بیٹی ثریا۔ مرزا علی خاں کی زوجہ اکبر ثانی کے عہد کی مشہور شاعرہ خانم۔ ضیاء حکیم انور علی کی بیٹی۔ علاوہ اُردو کے عربی۔ فارسی میں بھی مشقِ سخن تھا۔ لطیف پٹنہ کی مشہور شاعرہ۔ کیا سرسید۔ شبلی حالی کی مائیں جاہل تھیں یا محمد علی کی ماں جاہل ہے۔ سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال اور ان کی ماں شاہجہاں بیگم کے کارنامے روشن زمانہ ہیں۔

تعلیمِ نسواں کے جواز پر بحث کرنے کے لیے اولاً ہم کو خداوند کریم کے احکام پر نظر ڈالنی ضرور ہے۔ کلامِ پاک میں خواتین کے حقوق مردوں کے مساوی رکھے گئے ہیں۔ کسی امر میں ان کو مردوں سے کم حقوق نہیں دیئے گئے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

ومن عمل صالحا من
ذکرا و انثیٰ وھو مومن
فاولٰئک یدخل الجنۃ
یرزقون فیھا بغیر حساب

ترجمہ:- یعنی جو مومن مرد اور عورت اچھے کام کریں انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا اور بے حساب رزق دیا جائے گا۔

ان المسلمین والمسلمٰت
والمومنین والمومنات
والقانتین والقانتات
والصٰدقین والصٰدقات
والصابرین والصابرات
والخاشعین والخاشعات
والمتصدقین والمتصدقات
والصائمین والصٰئمت
والحافظین فروجھم
والحافظات والذاکرین
اللہ کثیرا والذاکرات
اعد اللہ لھم مغفرۃ و
اجراً عظیما

ترجمہ:- "بیشک مسلمان مرد مسلمان عورتیں ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں فرمانبردار مرد اور فرماں بردار عورتیں راست گو مرد اور راست گو عورتیں۔ صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ خاکساری کرنے والے مرد اور خاکساری کرنے والی عورتیں۔ روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں۔ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں۔ کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ

حفاظت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے

تیسری جگہ فرمایا گیا ہے :-

" اے لوگو اپنے رب کا پاس کرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا - اور اس کی جنس سے اس کا جوڑ پیدا کیا - اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتوں کو پیدا کیا - اللہ کا پاس کرو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو - اور عورتوں کے تعلقات کا پاس کرو یقیناً اللہ تم پر نگہبان ہے "

یہ آیات عورتوں کی مساوات مردوں کے ساتھ اور عورتوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی سند ہیں - یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آخری آیت میں مرد کا لفظ نہیں کہا - بلکہ جنس کہا اگر مرد کا لفظ ہوتا تو مردوں کو تقدیم کے فخر کا دعوے ہو سکتا - اس طرح نماز روزہ زکوٰۃ حج میں عورتوں کا درجہ مساوی ہے -

جس طرح عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیئے گئے - اسی طرح تعلیم کے متعلق بھی عام حکم ہے - مردوں کی تخصیص نہیں کی گئی - چنانچہ انسان کو علم حکمت کی طرف سے غفلت اور چشم پوشی کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض یمرون علیہا وھم عنہا معرضون تعلیم کے متعلق آنحضرت صلعم کے احکام بھی عام تعلیم کا حکم رکھتے ہیں - چنانچہ ارشادات ہیں

(۱) ہر مسلم اور مسلمہ پر علم حاصل کرنا فرض ہے - (۲) علم کو تلاش کرو اگرچہ وہ چین میں ہو - (۳) حکمت کو لے لو یہ امر تمھارے لئے مضر نہیں کہ وہ کس برتن سے نکلی ہے -

ایسے صاف اور صریح احکام کے بعد یہ کہنا کہ مذہبی رو سے تعلیم نسواں ناجائز ہے - کہاں تک انصاف پر مبنی ہے - انھیں احکام کی تعمیل میں بی بی عائشہ صدیقہ

بی بی اسما وغیرہ جلیل القدر خواتین نے علوم مروجہ حاصل کیا اور نہ صرف حاصل فرمایا۔ بلکہ پایہ کمال کو پہنچایا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ زمانہ گزشتہ میں کتنے علماء، فضلاء اور قاضی القضاۃ کی لڑکیوں وغیرہ نے علوم مروجہ میں کس درجہ کمال پیدا کیا تھا۔ درس اور لیکچر دیا کرتیں۔ مناظرہ اور مشاعرہ کی مجلسیں منعقد کرتی تھیں اور بڑے بڑے علماء وقت نے ان کی شاگردی کو فخریہ بیان کیا ہے۔ کیا اس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مذہبی روسے تعلیم نسواں ناجائز ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی خاتون اپنے مذہب سے واقف ہی نہیں ہو سکتی۔ تو کیا پھر یہ جائز ہو سکتا ہے کہ عورت کو تعلیم نہ دی جائے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو مذہب سے لاعلم رکھا جائے۔

عورت کی بہ لحاظ تمدن تین حالتیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ پہلی حالت بحیثیت اولاد ہونے کے۔ دوسری حالت بحیثیت شوہر کی زوجہ ہونے کے۔ اور تیسری بحیثیت صاحب اولاد ہونے کے۔ ان تینوں حالتوں کی واجبی انجام دہی بغیر تعلیم کے دشوار۔ ناممکن اور محال ہے۔

کیا والدین یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ کوئی اولاد بغیر تعلیم کے ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کو تعلیم کے بغیر یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ "ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے" ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے والدین کی اطاعت نہیں کی گئی۔

شوہر کو ہرگز ایسی عورت سے آرام و آسائش حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو تعلیم یافتہ نہ ہو۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایسی ہی عورت کے متعلق کہا ہے

زنِ بد در سرائے مردِ نکوست ہم دریں عالم است دوزخِ اوست

جاہل عورت نہ تو امورِ خانہ داری کو باحسن وجوہ انجام دے سکتی ہے اور نہ اپنے شوہر کے حقوق سے جو منجانب اللہ اس پر مقرر کئے گئے ہیں، واقفیت اور عمل پیرا ہو سکتی ہے تعلیم یافتہ خاتون اپنے شوہر کی سمجھ دار مشیر اور قابل مددگار ہوتی ہے۔ جاہل عورت سے ہمیں اس قسم کی امید کرنا ایک فعل عبث ہے۔ بچوں کی اعلیٰ جسمانی پرورش اولاد کی اخلاقی اور ابتدائی تعلیم بغیر تعلیم یافتہ ماں کے ناممکن ہے۔

الغرض اگر نیک اور اطاعت گزار اولاد منظور ہو وفادار بی بی انتظام خانہ داری کی عمدہ حالت مدنظر ہو۔ اگر آئے دن کے مخمصوں میں کسی کی غم خواری پیش نظر ہو۔ اگر دنیا کے کاروبار میں ایک سمجھ دار مشیر اور مددگار کی ضرورت ہو۔ اگر قومی توہمات کو دور کرنا منظور ہو۔ اگر خانگی فسادات کو مٹانا چاہتے ہو۔ اگر فضول خرچیوں سے دیوالہ منظور نہ ہو بیوہ عورتوں پر رحم آتا ہو اور ان کی بے بسی اور بے کسی شاق گزرتی ہو اگر بچوں کی اعلیٰ جسمانی پرورش۔ عمدہ اخلاق اور ابتدائی تعلیم منظور ہو تو ہرگز ہرگز اس سے گریز نہیں کہ جنس لطیف کو تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دی جائے"

کاروبار دنیا مثل ایک گاڑی کے ہیں جس کے پہیے مرد اور عورت کو خیال کیجئے۔ گاڑی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک دونوں پہیے ایک ساتھ گردش نہ کریں۔ اب اگر مرد تعلیم یافتہ ہو اور اس کی شریک زندگی جاہل تو صاف ظاہر ہے کہ دنیا کا کاروبار چلنا بالکل محال ہے۔ جس طرح ایک پہیے کی گاڑی

یہ بالکل صحیح ہے کہ تعلیم بجائے خود ایک عمدہ اور پسندیدہ چیز ہے۔ حضرت انسان کے بے شمار مسائل بغیر تعلیم کے ناممکن ہیں۔ اس قوت سے ہم مضر کو مفید۔ بیکار کو باکار۔ نااہل کو اہل۔ ناقابل کو قابل بنا سکتے ہیں۔ تعلیم

نہ صرف اپنی خوشی کو بڑھا سکتی ہے۔ بلکہ دوسروں کی مسرت کا موجب ہو سکتی ہے۔" کیا ایسی عمدہ اور بیش بہا چیز سے اپنے ہم دم وانیس وجلیس کا محروم رکھنا صحیح و درست ہو سکتا ہے؟ کیا یہ مقام افسوس و حسرت نہیں ہے؟۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ "آدم سے لے کر تا ایں دم عورت نے انسان کی انسانیت ۔ شائستگی اور تمدن کی تعمیر میں بے انتہا کوشش کی ہے مرد کے لئے کھانے پینے رہنے سہنے کے سامان مہیا کرنا۔ اس کے آرام کے لئے شبانہ روز کی محنت شاقہ برداشت کرنا۔ اناج بونا۔ ہل چلانا۔ کھیت کاٹنا چکی ایجاد کرنا۔ آٹا پیسنا۔ روٹی پکانے کے اوزار دریافت کرنا۔ روٹی پکانا غرض زندگی کے ہر شعبہ میں بیش قیمت ایجاد سب عورتوں کے ہی کارنامے ہیں "صنف لطیف کے مردوں پر یہ ایسے احسانات ہیں جن سے تا قیامت سر نہیں اٹھایا جا سکتا۔ کیا پھر ایسی صورت میں خواتین کو تعلیم سے روکنا روا ہے؟ ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کی رائے میں صرف مذہبی تعلیم کافی ہوا کرتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے وہ مخالف ہوتے ہیں۔ اپنے دعوے میں اکثر مندرجہ ذیل وجوہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) اعلیٰ تعلیم کی جنس لطیف کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ ان کا فریضہ نہیں بلکہ مردوں کا فریضہ ہے۔

(۲) اعلیٰ تعلیم پانے سے وہ شوہر کی فرمانبرداری نہیں کرتی۔

(۳) انتظام خانہ داری کے بجائے اخبار اور ناول بینی کا شوق اور جلسوں کی شرکت کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

(۴) جنس لطیف کی حالت نہایت نازک ہوتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

(۵) اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے پردہ ناممکن ہے۔ اور پردہ ازروئے مذہب فرض ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ جنس نازک کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں۔ اس کے متعلق جب ہم احکام خداوندی کو مدنظر رکھیں تو دعوے بلا دلیل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جو حقوق مرد کو عطا ہوئے وہی خواتین کو بھی دیئے گئے ہیں۔ جن کو مختصر طور پر میں نے بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کے اقوال بھی جو بیان ہو چکے تعلیم کے متعلق عام ہیں۔ مردوں کے لئے کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ اگر درحقیقت خواتین کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہ ہوتی تو ضرور تشریح ہوتی برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی صحابیہ یہاں تک کہ ازواج مطہرات تک نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اگر اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہ ہوتی تو بی بی عائشہ صدیقہ کو کوئی ضرورت نہ تھی کہ ادب اور طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں۔ علاوہ اس کے میں نے جو فہرست سابق میں دی ہے اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف خلفائے وقت کی اولاد نے بلکہ علما و فضلا یہاں تک کہ قاضی القضاۃ تک کی اولاد اناث اور عام خواتین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ علانیہ ان علوم کا درس اور لیکچر دیا۔ ابن عساکر علامہ حجر عسقلانی۔ علامہ سیوطی۔ ابن خلدون جیسے شیوخ وقت نے اپنے اپنے زمانہ میں خواتین سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اگر اعلیٰ تعلیم کی خواتین کو ضرورت نہ ہوتی تو کس طرح علمائے سابقہ اس کو جائز رکھتے۔ ان دلائل کے بعد ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مذہبی روسے اعلیٰ تعلیم جائز نہیں۔

بہ لحاظ تمدن کے بھی اعلیٰ تعلیم خواتین کے لئے نہایت ضروری و لابدی ہے۔ کوئی سمجھ دار شخص اس کو باور نہیں کر سکتا کہ کوئی شریف

خاتون مذہبی روسے شوہر کے حقوق سے آگاہ ہو اور اسپر کاربند ہو آپ نے تعلیم تو دی مگر مذہبی تعلیم سے نابلد رکھا تو اس میں بے چاری عورت کا اور اعلیٰ تعلیم کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ معترضین خود اپنے دل میں سوچیں کہ انھوں نے باوجود اپنی بی بی کے حقوق سے آگاہ ہونے کے کہاں تک اس پر عمل کیا۔ اگر کیا ہوتا تو اس قسم کے سوال کی نوبت ہی نہیں آتی۔

میں اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ کہ کوئی تعلیم یافتہ خاتون امور خانہ داری کو انجام نہ دے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے وہ اور عمدہ طور پر اس کو کر سکتی ہے۔ اخبار بینی وغیرہ کوئی معیوب امور نہیں۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ خاتون اپنے عزیز وقت کو بے کار صرف کرنے کی بجائے مطالعہ میں صرف کرے تو اس سے عمدہ کیا بات ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں چونکہ فی زمانہ تعلیمی نصاب نادرست ہے۔ اس لئے یہ خرابیاں ایک حد تک پیدا ہوتی ہیں کہ وہ امور خانہ داری سے واقف نہیں کرائی جاتیں۔ اگر نصاب میں واجبی ترمیم ہو تو حسن نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نصاب کی درستی کے بجائے اعلیٰ تعلیم کو بری کہنا اور ناجائز ٹھیرانا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ نیز ہر ایک عورت کی طبیعت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ امور خانہ داری کو انجام نہ دے اور اس کے بجائے گانے بجانے میں اپنے وقت کو صرف کرے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن کی سرشت ہی بری ہو اس کو تعلیم نہ بھی دی جائے تو یہ خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک اور وجہ مانع اعلیٰ تعلیم جسمانی نزاکت بیان کی گئی ہے۔ اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ ہر خاتون کے اعضا ایک ہی قسم کے نہیں ہو سکتے۔ یہ کلیہ قائم کر لینا کہ تمام خواتین کی جسمانی حالت اعلیٰ

تعلیم کی مانع ہے ایک مہمل خیال ہے۔ کیونکہ اس کے خلاف آج امریکہ یورپ میں صدہا بلکہ ہزارہا خواتین ایسی ہیں جنہوں نے مشکل سے مشکل فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے کیا جسمانی حالت ان کے مانع نہ تھی؟ ہاں میں اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں کہ بعض فنوں کی تعلیم سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اس فن کی تعلیم ان کو نہ دی جائے۔ نہ یہ کہ سرے سے کل اعلیٰ فنون کی اعلیٰ تعلیم سے روک دیا جائے۔

آخری وجہ میں چونکہ پردہ کا تعلق آتا ہے اس لئے اس پر آئندہ بحث کی جائے گی۔

(رسالہ ترقی حیدرآباد)

سنہ ۱۹۲۰ء

ہماری جدید خاتون کا تعلیمی نصاب

جنگ عظیم کے بعد یورپ خصوصاً انگلستان کی خواتین کی حالت میں، جو عظیم الشان تغیر ہوا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ جس سرعت کے ساتھ ان کو آزادی ملی اور دنیا کے ہر ایک کام میں جس سرگرمی سے وہ حصہ لینے لگیں وہ اب ایک حقیقت نفس الامر ہے۔ آج وہ کون شعبہ ہے جس میں مردوں کے دوش بدوش عورتیں حصہ نہ لے رہی ہوں۔ زندگی کے مشکل سے مشکل کام کھیل کود کے ہر ایک دنگل۔ شہرت اور نام آوری کے ہر میدان میں عورتوں کا نام چوٹی پر آنے لگا ہے۔ موٹر ریس۔ ایروپلین کی سیاحت اور ہمالیہ کے اسفار غرض مشکل سے مشکل کام میں وہ شریک اور گوئے سبقت لے جا رہی ہیں

یورپ سے قطع نظر مشرقی ممالک کی حالت میں بھی عظیم الشان تغیر ہو چکا ہے جیسا کہ مصر۔ عراق حجاز میں بھی عورتیں معراج کمال پر پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں۔ چنانچہ ایک مصری خاتون کا نام فن پرواز میں مشہور ہونے لگا ہے

ایسی حالت میں خود بخود ہمارے خواتین کی حالت پیش نظر ہو جاتی ہے اور یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہے؟ اور یہ کس راستے پر جا رہی ہیں؟ کیا ہم یورپ اور امریکہ کے ہی نمونہ پر اور ان کے ہی اصول پر ترقی کرنا چاہتی ہیں کیا ان کا مطمح نظر بھی یورپ جیسا ہے؟

ان سوالوں کے جوابات خود خواتین سے حاصل کرنے چاہئیں۔ کیونکہ وہی اپنی حالت کا بہتر اندازہ کر سکتی ہیں۔ مگر ہم بھی اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے کچھ نہ کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے ہماری عورتیں ضرور ترقی

کر رہی ہیں۔ اور ان کی ترقی قریب قریب یورپ ہی کے نمونہ پر ہو رہی ہے۔ دوسرے دونوں سوالات کے جوابات ہم نفی میں دینے کے لئے مجبور ہیں۔ کیونکہ ہم کو اسی اصول پر ترقی کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارا مطمح نظر یورپ کے مطمح نظر سے جدا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

ابھی حال میں رسالہ حسن کار میں ایک محترم بہن مس رضیہ کا مضمون "ہماری جدید خاتون" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس سے واضح ہے کہ ان کی رائے بھی اسی نظریہ کے موافق ہے کہ ہماری ترقی یورپ کے نمونہ پر نہ ہونی چاہیے۔

مگر ہم یہ کلیہ ہرگز قائم نہیں کر سکتے اور یہ قرار نہیں دے سکتے کہ ہماری تمام بہنیں اسی طرح خیال کرتی ہوں گی اور وہ یورپ کے نمونہ کو پسند نہ کرتی ہوں گی۔ اور اپنی شہرت اور نام آوری کو یورپین اصولوں پر قائم کرنے کی متمنی نہ ہونگی۔

بیشک یہ وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہماری بہنیں پان چبا کر اور مسی کی دھڑی جما کر کاجل آنکھوں میں مل کر "چراغ خانہ" بنی رہیں۔ بلکہ اب وہ زمانہ ہے جبکہ گیسو تراش کر غازہ مل کر لبوں کو سرخ کر کے نئے ڈھنگ کے لباس میں....... ساعد اور بازو کی عریانی کے ساتھ حسن و رعنائی کو نمایاں کرتے ہوئے پوڈر و لیونڈر کی لطیف مہک کے ساتھ منظر عام پر جلوہ آرا ہوں اور شمع محفل بنیں۔

مجھے ان کے اس خیال سے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اس کا بھی سامان مہیا ہوتا ہے یا نہیں کہ ہماری بہنیں اس سرزمین کے "رامزے میکڈونلڈ" کو بھی پیدا کریں۔ لائڈ جارجوں کو بھی وجود میں لائیں۔ مارشل ہیگون کو بھی پیدا کریں۔ مسولینی بھی پیدا ہو تو ہر ہٹلر

بھی۔ ماؤں کے دودھ سے ہی بچے کی سرشت میں علم و عرفان کا خون سارہی ہو جائے۔ بلند اخلاق اور اعلیٰ تہذیب کا نمونہ ماؤں کی گود سے ہی نظر آنے لگے۔ محبت و ملنساری کا سبق بھی وہیں مِل جائے۔ اگر اس کے ساتھ پردہ اُٹھ جاتا ہے تو اُٹھ جائے چشم ما روشن دِل ماشاد۔ یہ کوئی بڑی اور گراں قیمت چیز نہیں۔ کہ ادا نہ کی جا سکے۔ مگر دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ قیمت ادا کر کے کونسی متاعِ گراں مایہ ہم خریدتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ محض معاملہ کی گفت و شنید میں ہی مشرقی شرم و حیا کی اعلیٰ روایات مغربی رعنائی اور دلربائی کے بدل ہو جائیں۔ اور مشرقی عفت اور عصمت مغربی آزادی کی دیوی کے نظر ہو جائے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہمارا موجودہ نصاب اور ہماری تربیت کا موجودہ ڈھنگ ہم کو اسی راہ پر لے چل رہا ہے جس سے اس امر کی تائید ہوتی جا رہی ہے کہ معاملہ کی گفت و شنید ہی میں ہماری مشرقی شرم و حیا کی اعلیٰ اور بہترین روایات مغربی رعنائی اور دلربائی کی بدل ہو جا رہی ہیں۔ اور شوخی و شرارت حد سے سوا ہو کر مشرقی عفت عصمت کو مغربی آزادی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہی ہے۔

ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم اور ہمارا موجودہ طریقۂ تعلیم ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ہم مشرقی اور مغربی اعلیٰ محاسن سے متمتع ہو سکیں۔ ہمارا نصاب ہمارے درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ ہماری خواتین کی تعلیم میں وہی چیزیں داخل ہیں۔ جو ہمارے مردوں کے نصابِ تعلیم میں شامل ہیں۔ حالانکہ دونوں میں فرق ہونا ضروری ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر ایک نہیں سینکڑوں مرتبہ اعلیٰ ترین ماہرانِ تعلیم اور علماءِ نفسیات و عمرانیات نے روشنی ڈالی ہے اور مردوں

وعورتوں کے نصاب تعلیمی کو جدا رکھنے پر زور دیا ہے۔ لیکن دراصل یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اب بھی وہاں ہی ہیں۔ جہاں پہلے تھے۔

اگر ہم اپنے عادات اور اطوار تہذیب و تمدن میں پوری طرح مغرب کی تقلید ہی کرنا چاہتے ہیں اور مغربیت میں جذب ہوجانا ضروری تصور کرتے ہیں تو ضرور تقلید کی جائے مگر ان ہی شرائط کے ساتھ جن کا ذکر کیا گیا ہے ہماری موجودہ تعلیم اور موجودہ نصاب صرف پہلے جز کی تعلیم دیتا اور پہلے جزو کو پورا کر رہا ہے دوسرے جز کی دوا نہیں ہوتا۔

ہمارے لئے ایسے نصاب کی ضرورت ہے جس سے ہماری بہنیں مشرقی اور مغربی تمدن اور تہذیب کی خوبیوں و برائیوں کو سمجھنے کے قابل ہوجائیں۔ ہماری بہنیں تاریک خیالی توہم اور جہالت کے بھنور سے نکل آئیں۔ تو اس کے ساتھ ہی ان میں کامل صحت بدن کی پوری چستی اور دماغ کی تازگی بھی باقی رہے۔ ایک ایسا نصاب تعلیم ضروری ہے کہ جس سے خواتین کے ذہنی قوا مجلا ہوجائیں۔ تو ساتھ ہی ساتھ ان کے نسوانی جذبات بھی اپنے پورے شباب پر قائم رہیں۔ اسکول وکالجوں میں ان کی تربیت کچھ اس ڈھنگ سے ہو کہ ماں بننے کے بعد وہ اپنے بچوں کی اس طرح دیکھ بھال کریں کہ یہی بچے آگے چل کر ایک اعلیٰ تہذیب کی کامل حفاظت کرسکیں۔

مذہب۔ اخلاق۔ معاشیات امورخانہ داری۔ تربیت اولاد۔ حفظان صحت۔ اور موسیقی کو عورتوں کے نصاب میں خصوصی درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ بلاشبہ یہ مضامین ایک حد تک مشترک ہیں۔ لیکن ان کے متعلق کتب نصاب مرتب کرنے میں عورتوں کے مخصوص ضروریات کا خاص لحاظ ہونا چاہیے کتب نصاب کی زبان اسلوب بیان اور طرز استدلال سب میں نسوانیت

کے عنصر کو غالب رہنا چاہیے۔

ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے لڑکے مذہبی تعلیم سے جی چراتے ہیں اور اس کو غیر ضروری تصور کرکے پس پشت ڈال دیتے ہیں ہمیں معلوم اس بارے میں ہماری بہنوں کی کیا حالت ہے۔ بظاہر ان سے بھی یہی توقع کی جانی چاہئے جو لڑکوں سے ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس وقت تک تعلیم میں مذہب اور اخلاق کا جزو غالب شریک نہ ہوگا۔ اور اسلامی بہترین اخلاق کی تعلیم نہ ہوگی۔ اس وقت تک مغربی آزادی کے مقابل شرقی عفت وعصمت کی محافظت قطعاً نہ ہوسکیگی۔ عفت وعصمت تو خیر خدا شناسی بھی باقی نہ رہے گی یہ تو مذہب کے متعلق ہوا۔ معاشیات اور امور خانہ داری کے متعلق واضح ہو کہ مالدار خواتین یورپ جہاں دنیا بھر کے اسراف کرتی لہو ولعب میں شریک ہوتی۔ فیشن پر ہزاروں روپیہ صرف کرتی ہیں وہاں ایسی خواتین کی بھی اکثریت ہے جو آمدنی اور خرچ کو متوازی رکھنے میں اپنی پوری توت صرف کرتی ہیں۔ کفایت سے خرچ کرنا اور پس انداز کرنا ان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ وہ گھر کے کاروبار میں اصول معاشیات کو پوری طرح کام میں لاتی ہیں۔ افسوس ہے ہماری بہنیں اس پر کار بند نہیں ہوتیں۔ وہ عموماً اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتی ہیں۔ فیشن کی پابندی کی خاطر قرض دار ہوتی ہیں۔ خود تو کچھ کماتی نہیں اور مردوں کے لئے ان کا قرضہ وبال جان ہوجاتا ہے۔ خواتین یورپ کی طرح فیشن کی تو پابندی کریں گی۔ مگر ان کے اصول معاشیات خانہ داری کو نظر انداز کردیں گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ آمدنی اور خرچ کو متوازی رکھنے کے اصول بچپن ہی سے لڑکیوں کے ذہن نشین کرائے جائیں۔ اور پس انداز کرنے کے عملی طریقوں سے ان کو پابند کرایا جائے۔

یورپ کی ایک عورت جس طرح موٹر ریس میں نام کمائیگی اور پروازی میں شہرت حاصل کرے گی۔ وہاں امور خانہ داری کو انجام دینے میں بھی اس کو یدطولیٰ حاصل ہوگا۔ کیا ہماری عورتیں اس پر کاربند ہیں؟

تربیت اولاد کا جو سلیقہ یورپ کی عورتوں نے حاصل کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ گھر میں ابتداً اولاد کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ یورپ کی سربرآوردہ ہستیاں چاردانگ عالم میں اپنی قابلیت کا سکّہ بٹھانے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں اس کے مقابل ہماری جو حالت ہے وہ بھی روز روشن سے کم نہیں۔

اصول حفظان صحت سے واقف ہونے کے جو نتائج آج عموماً ہندوستان میں خصوصاً مسلمانوں میں نظر آتے ہیں یہ محتاج توضیح نہیں۔ اطفال کی اموات کی جو کثرت ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اصول حفظان صحت سے واقفیت کا کیا حال ہے۔ ہماری تہذیب رفتہ کے لحاظ سے ہر خاتون بچوں کی گھٹی اور بڑوں کے جوشاندوں سے واقف ہوتی تھیں اس سے جو فوائد تھے وہ بہت تھے۔ جدید رنگ میں رنگے جانے کے شوق نے افسوس ہماری خوبیوں کو بے رنگ کردیا۔

موسیقی جیسی غذائے روحانی سے اب بھی بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ انسان کے جذبات لطیف میں توازن قائم رکھنے کے لئے اس کی جس قدر ضرورت ہے وہ خود ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں گھر کی بیگم کا اس سے واقف نہ ہونا کس قدر تعجب خیز ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو میاں تفریح کے لئے گھر سے کوٹھے پر جانے کی عادت نہیں چھوڑ سکتے۔

ان چیزوں کا ہماری جدید خاتون کے نصاب تعلیم میں اس طور سے

شامل ہو تاکہ ان کا افادہ عام ہو جائے ضرور ہے تاکہ اگر وہ ایک طرف مغربی تمدن اور تہذیب سے واقف ہو کر آزاد ہو جائے تو دوسری طرف مذہب کے پاکیزہ اصول سے واقف ہو کر اپنی آزادی کو اس طور سے کام میں لائے کہ قدیم مشرقی عفت و عصمت کو چار چاند لگ جائیں اگر ایک طرف تمدن یورپ کے اثر سے نازکی اور رعنائی کے جدید آئین اختیار کرے تو وہیں اصول معاشیات کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ اگر ایک طرف کھیل و تفریح کے میدان میں گوے سبقت لے جانے لگے تو دوسری طرف امور خانہ داری اور تربیت اولاد کے جو گُر ہیں ان سے بھی واقف ہو جائے

جب تک روز اول سے آخر تک اور بچپن ہی سے ختم تعلیم تک ان امور کا لحاظ نہ رکھا جائیگا اُس وقت تک ہمارے لئے ہماری جدید خاتون کا نصاب مفید نہیں ہو سکتا۔

تعلیمی نصاب کے ساتھ ساتھ درستی اخلاق کا مسئلہ بھی ہے۔ اور اس کے لیے جس طرح ابتدا سے عمدہ نصاب کی ضرورت ہے اسی طرح درستی اخلاق کے لئے عمدہ معلمات کی ضرورت ہے کیونکہ تعلیم و تربیت کا سارا دارومدار بہترین معلمات پر منحصر ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے۔ ہمارے یہاں عمدہ معلمات کی نہ صرف کمی ہے بلکہ کال ہے اور معاف فرمائیں اگر ہم یہ کہوں کہ معلمات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابل اطمینان قرار دی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بعض اصحاب سو سر سے سے تعلیم نسواں پر کوئی اعتقاد نہیں۔ ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار جن افراد پر ہے اور جن کی تربیت اور تعلیم سے ہماری اولاد متمتع اور بہرہ مند ہوتی ہے۔ اور آگے چلکر اس کارخانہ عالم میں حصہ لیتی ہے۔ ان کی بنیاد مضبوط اور مستحکم

اور اعلیٰ نہ ہونا جس طرح سفرت رساں ہو سکتا ہے وہ لائق اظہار نہیں لہٰذا اولاً اعلیٰ معلمات کا فراہم کرنا ضروری ہے۔ جن کے اخلاق عمدہ اور جن کی سیرت پسندیدہ ہو جن پر حرف گیری کا موقع نہ مل سکے۔

بہرحال نصاب تعلیم کے ساتھ بہتر نگرانی کی بھی سخت ضرورت ہے۔ بغیر اصلی نگرانی کے بہتر نصاب اور قابل اور نیک معلمات سے کوئی فائدہ نہیں سارے مدارس میں یکساں باقاعدگی تنظیم اور جوش عمل کامیابی کے اصل گر ہیں۔ کام کی بنیاد جب تک ان امور پر قائم نہ ہو جو روپیہ صرف ہوگا وہ رائیگاں جائے گا۔ جو قوت صرف ہوگی وہ بے ثمر رہے گی۔ اور جو وقت صرف ہوگا وہ جا چکنے کے بعد پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

رسالہ شہاب ۱۹۳۵ء ۶

خواتین یورپ اور ہندوستان کی مسلمان عورتیں

یورپ کی عورتوں اور ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی موجودہ حالت پر کچھ لکھنے سے پہلے ان دونوں کی سابقہ حالت پر مختصر تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ آج سے چند صدی پہلے یورپ کی عورتوں کی حالت جس قدر پست اور زبون تھی اور ان پر جو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی وہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف تمدّن اور معاشرت کے لحاظ سے بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی قابل رحم تھی

ازمنہ متوسط میں اگر عورتوں کے حقوق اور ان کی حالت پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی کوئی ہستی نہیں سمجھی جاتی اور اس کی کوئی عزت و وقعت نہیں کی جاتی اس کا کوئی حق نہیں۔ اس کی حالت جانوروں کی سی تھی۔ اس زمانہ کے عیسائی سرداروں کو عورت کا مطلق پاس نہ تھا۔ ان کے ساتھ نہایت بری طرح پیش آتے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ عورت موت سے زیادہ تلخ ہے۔ عہد قدیم کے مواعظ میں لکھا جاتا تھا کہ جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنی عورت سے بچے گا۔ ہزاروں مردوں میں ایک خدا کا پیارا ہوتا ہے۔ لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو خدا کو پیاری ہو۔

روم میں مردوں کی حکومت اپنی اپنی بی بی پر جابرانہ ہوتی تھی۔ عورت ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کا معاشرت میں کوئی حصہ نہ تھا۔ شوہر کے سوا اس کے افعال کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ شوہر کو پورا پورا حق اس کے

جسم و جان و مال پر حاصل تھا۔

یونان میں عورتوں کو ایک کم درجہ مخلوق سمجھتے تھے جن کا کام صرف امور خانہ داری اور ترقی نسل تھا۔ انھیں وراثت بھی نہیں ملتی تھی۔ یونان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن کے زمانہ میں بھی بجز طوائف کے کسی عورت کی قدر نہیں ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے سوائے طوائف کے کوئی عورت تعلیم یافتہ نہ ہوتی تھی۔

انگلستان وغیرہ میں بھی عورتوں کی حالت نہایت ابتر تھی۔ کوئی عورت اپنے نام سے کوئی معاہدہ نہیں کرسکتی تھی اس کی جائداد بھی جو نکاح سے پہلے اس کی ملکیت تھی شوہر کی ملکیت ہوجاتی تھی۔ اس کو اختیار نہیں تھا کہ اپنی جائداد بلا شوہر کی اجازت کے کسی کو دے۔ قانون وکٹوریہ سے پہلے اس عورت کے لئے کوئی چارہ جوئی کی سبیل نہ تھی جس کو شوہر نے قصداً چھوڑ دیا ہو۔

یونان میں یہ دستور تھا کہ جس وقت کسی عورت سے بچہ ہوچکتا تو فوائد ملکی کے مدنظر بغرض استبضاع اس کے خاوند سے اس کو عارتیاً لے لیتے تھے۔ وہ ایک جائداد منقولہ تصور کی جاتی تھی۔[۵]

امریکہ و یورپ کے دیگر مورخین بھی عورتوں کی بدترین حالت کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر اسکاٹ لکھتا ہے "تمام ممالک میں ان عورتوں پر ناقابل بیان سختیاں توڑی جاتی تھیں۔ وحشیوں کی صحبت اور وحشیانہ گرد و پیش ان کو ذلیل کیے ہوئے تھے۔ اگر وہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں تو اپنے بزرگوں یا آقاؤں کا کھلونا ہوتی تھیں اگر کمتر درجہ کی ہوتی تھیں تو تحقیر و تذلیل ہر قسم کی تکالیف و رنج حالت کنیز گی۔ یہ سب باتیں دین دار عیسائی دنیا کی عورتوں کی قسمتوں میں لکھی ہوئی تھیں۔

۵ے۔ یہ حالات تمدن عرب سے نقل کیے گئے ہیں۔

عورتوں کی ترقی کا آغاز نشاۃ ثانیہ (وہ دور جس میں علوم قدیمہ کا احیاء ہوا) سے ہوا۔ اس تحریک کے باعث اہلِ علم اشخاص کی عزت و وقعت ہونے لگی جن میں عورتیں بھی شریک تھیں۔ اس کے بعد اصلاح مذہبی کا دور آیا۔ اس میں بھی عورتوں کی حالت درست ہوئی۔ طباعت کی ایجاد سے علوم کی اشاعت میں ترقی ہوئی جس کے باعث قابل عورتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

موسیو لیبان اور پروفیسر اسکاٹ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ عورتوں کی عزت اور ان کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں سے اخذ کی گئی ہے۔ چنانچہ لیبان لکھتا ہے

"اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حالت کو درست کیا۔ تمدن اسلام میں عورتوں کو بالکل وہی مرتبہ دیا گیا جو انھیں بہت دنوں بعد یورپ میں حاصل ہونے والا تھا۔ اہل یورپ میں سپاہیانہ اخلاق جس کا بڑا جزو عورتوں کا برتاؤ تھا عربوں سے آیا اور وہ عیسائی مذہب نہ تھا بلکہ اسلام تھا جس نے عورتوں کو ان کی اس وقت کی گری ہوئی حالت سے ترقی دی۔" اسکاٹ لکھتا ہے:-

"عورتوں کے ساتھ مہربانی ان کی عزت اور ان کی حمایت جو ہر حربی سپاہی کا لاینفک اخلاقی فریضہ ہے بلکہ شجاعت کا اصل اصول ہے۔ مسلمانان اندلس سے شروع ہوا۔ دسویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی تک تمام مسیحی یورپ میں عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ وہ عزت و نرمی روا نہ رکھی جاتی تھی جو مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ اس کلیہ سے وہ ممالک مستثنیٰ تھے جن پر مسلمانوں کی تہذیب و اخلاق کا اثر پڑ چکا تھا۔"

غرضکہ اسلامی اثر کے بعد دن بدن عورتوں کی تمدنی اور معاشرتی حالت میں اصلاح ہونے لگی۔ اٹھارہویں صدی میں عورتوں کے قائم کردہ مذہبی فرقوں کو بہت ترقی ہوئی۔ انیسویں صدی میں عورتوں کی ترقی کی عام تحریک پیدا ہو گئی

۱۸۴۷ء میں لولئی آٹو نے نے مسئلہ
نسواں کا ایک مفصل پروگرام مرتب کیا۔ اور دکھایا کہ حکومت کے معاملات میں حصہ لینا عورتوں کا حق ہی نہیں۔ بلکہ ان کا فرض بھی ہے۔ اور اس فرض کی انجام دہی کے لیے حکومت کو چاہیئے کہ تمام عورتوں کو تعلیم دے۔ سیاسی حقوق کے ساتھ معاشرتی آزادی بھی طلب کی گئی ۱۸۶۵ء میں جان سٹورٹ مِل عورتوں کے ووٹ کے بدولت پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ اسی سنہ میں جرمنی میں بھی دو اہم انجمنیں قائم ہوئیں، جو عورتوں کے حقوق سے متعلق تھیں۔ ۱۸۸۲ء میں مِل کی کتاب عورت اور اشتراکیت شائع ہوئی جس کا مقصد مردوں اور عورتوں کی مساوات کو پیش کرنا تھا۔ اس کتاب کا بڑا اثر ہوا۔ اور اس کے خیالات عام طور سے تسلیم کیے گئے۔ غرضکہ یہ تحریک ترقی کرتی گئی یہاں تک جنگ عظیم کے بعد وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے لیے برسوں کوشش کی جارہی تھی۔

جنگ عظیم کے بعد جو زبردست انقلابات ہوئے ان میں سے ایک عورتوں کے درجہ اور مساوات کا انقلاب ہے۔ اسّی نوّے سال سے جس امر کی کوشش ہو رہی تھی وہ یک بیک جنگ کے بعد حاصل ہو گیا۔ اس عرصہ میں عورتوں کی جد و جہد سیاسی۔ معاشیاتی تعلیمی شعبوں میں جاری تھی۔ اور کہیں کہیں اس قسم کے حقوق ان کو حاصل ہو گئے تھے۔ لیکن ان مطالبات کی تکمیل جنگ کے بعد ہوئی اب بہت کم ایسے شعبے ہیں جن میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش نہ ہوں۔ پارلیمنٹ کی وہ ممبر ہیں۔ سرکاری دفاتر میں اعلیٰ خدمات پر فائز ہیں۔ عدالت میں وکالت کرتی ہیں جیوری کی رکن ہوتی ہیں۔ میئر بلدیہ

ہو جاتی ہیں - آج علم وفن کی وہ کونسی شاخ ہے اور صنعت وحرفت کا کونسا شعبہ ہے جس میں صنفِ نازک شامل نہیں - اور مردوں کے ساتھ ساتھ کام نہیں کرتی

اب یورپ میں جنسِ لطیف کا درجہ کسی شاخ میں مردوں سے کم نہیں ہے ترقی کے زینہ پر دونوں ساتھ ساتھ گامزن ہیں - ان کے سیاسی حقوق ان کے معاشرتی حقوق ان کے تمدنی حقوق انھیں حاصل ہیں - ایک خاص عمر کے بعد وہ ہر طرح آزاد ہیں کسی امر میں وہ کسی کی محتاج اور دست نگر نہیں - وہ خود کماتی ہیں وہ خود محنت کرتی ہیں وہ خود مشقت کرتی ہیں اور دولت پیدا کرتی ہیں - ان کی قابلیت ان کی لیاقت ان کی جفاکشی ان کی اولوالعزمی مردوں سے کم نہیں وہ کونسی نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک مہم نہیں ہے جس میں عورت کا حصہ نہیں اور اس کی شرکت نہیں - ابھی حال کا فضائی سفر جو لنڈن سے اسٹریلیا تک ایک خاتون نے کیا - فراموش نہیں ہو سکتا - اسی طرح کوہ ہمالیہ کی مہم میں ایک باہمت خاتون نے پیش قدمی کی ہے -

غرضکہ یہ طویل داستاں ہے جس میں عورتوں کے کارہائے نمایاں جلی حروف میں نظر آتے ہیں - یورپ کی ترقی کا اب کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں عورتوں کا خاصہ حصہ نہیں ہے - جہاں مرد ہیں وہاں عورتیں بھی مقابل ہیں -

اس کے برخلاف اگر ہم ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی حالت پر نظر کریں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے - اور حیرت ہوتی ہے کہ کیا اس مذہب سے تعلق رکھتی ہیں جس میں دونوں کو مساوی حقوق دیئے گئے ہیں اور کیا یہ اسی قوم کی نسل اور اسی کی اولاد ہیں جس کے کارنامے تاریخ میں سنہرے حروف سے نظر آتے ہیں - قبل اس کے کہ ہم اپنی موجودہ حالت پر کچھ لکھیں ہماری گذشتہ حالت کا تبصرہ بھی ضروری ہے سب سے پہلے مذہب ہے

لہذا مذہبی لحاظ سے دیکھو تو معلوم ہوگا قرآن پاک نے دونوں کو مساوی قرار دیا ہے اور عورتوں کی وراثت لازمی قرار دی۔ ان کو اپنی ذاتی جائداد کا ہر حال میں مالک و مختار قرار دیا۔ آنحضرت نے عورتوں کی واجبی تعظیم و تکریم کی ہدایت فرمائی اور اپنے بہترین عمل سے اس کی ترغیب دلائی۔ ارشاد فرمایا جو صاحب عزت ہیں وہ عورتوں کی عزت کرتے ہیں اور جو بُرے ہیں وہ ان کی توہین کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا عورتوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دو منکوحہ عورتوں کے قانونی حقوق جو از روئے احکام قرآنی مقرر ہوئے ہیں وہ یورپ کے قوانین سے بدرجہا مفید ہیں۔

اسلام میں عورتوں کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اعتراف یورپین مورخ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مورخ موسیو دے ایسی لکھتا ہے۔

"عورتوں کا عموماً بڑا اعزاز ہے۔ اور ان کے ساتھ مردانہ اخلاق برتے جاتے ہیں کوئی شخص راستہ میں کسی عورت کو ستانے کی جسارت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ لڑائی جھگڑے کے وقت بھی ایک ادنیٰ سپاہی بدزبان سے بدزبان عورت کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ شوہر اپنی بی بی کے ساتھ نہایت خلق و مدارات سے پیش آتا ہے اور ماں کی عزت تو پرستش کی حد تک ہوتی ہے۔ کوئی مرد عورت سے مزدوری کرا کے اس کی کمائی نہیں لیتا۔ بلکہ مرد ہی عورت کو دیتا ہے۔ طلاق کی صورت میں شوہر اس قدر نفقہ دینے پر مجبور ہے جس میں عورت آرام کے ساتھ بسر کر سکے۔ اور یہ مجبوری مرد کو اس قسم کی بدسلوکی کرنے سے مانع ہوتی ہے جس سے عورت کو خلع کا حق پیدا ہو جاتا ہے۔"

موسیو مارتھا سینٹ ہیلیر ایک دوسرا فرنچ مورخ لکھتا ہے:۔

"اسلام نے عورتوں کی حالت کی بہت اصلاح کی ہے اور یہی مذہب ہے

جس نے ایسا کیا ہے بہت آسانی سے ثابت ہو سکتا ہے کہ کل اور مذاہب میں اور کل اور اقوام میں جو عربوں سے پہلے تھیں عورتوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی"

موسیولیبان لکھتا ہے :-

"اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حالت کو درست کیا اور چونکہ مشرق میں بمقابلہ یورپ کے عورت ہمیشہ معزز اور محترم رہی تعلیم و تربیت اور آسودگی میں بھی وہ اپنی مغربی بہنوں سے عموماً زیادہ فائق ہے۔ تمدن اسلام میں عورتوں کو بالکل وہی مرتبہ دیا گیا جو انھیں بہت دنوں بعد یورپ میں حاصل ہونے والا تھا"

زمانہ سلف میں اسلامی خواتین جس طرح علم و ہنر میں سرآمد روزگار ہوئی تھیں وہ تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بعد حضرت سکینہ بنت حسین علیہ السلام کے کارنامے خولہ بنت ازور کے معرکے تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں تعلیم نسواں کا عام طور پر دستور تھا۔ یہی وجہ تھی بہت ساری خواتین علم حدیث، فقہ، صرف و نحو، ادب، شاعری، ریاضی، طبابت، کتابت، موسیقی وغیرہ علوم میں سرآمد روزگار تھیں۔

ان میں نہ صرف خلفاء و امراء و قضاۃ کی بیٹیاں تھیں بلکہ ہر درجہ کی خواتین شریک تھیں۔ بعض خواتین کا علم وفن میں یہ پایہ تھا کہ اس وقت کے بڑے بڑے شیوخ وقت مثلاً علامہ سیوطی، ابن حجر عسقلانی، خطیب بغدادی، ابی القاسم بہرانی، علامہ ابن عساکر، قاضی تقی الدین سلیمان، صلاح الدین صعفدری وغیرہ نے شاگردی کی ہے۔ خود ہندوستان میں صدہا باکمال خواتین گزری ہیں جن کے ناموں کی

فہرست بھی طوالت کا موجب ہوگی۔

مسلمان خواتین کے علمی کارناموں کا اظہار غیر مذہب کے مورخین بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک عیسائی مورخ الحکم ثانی (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ) کے زمانہ میں عمراحت کرتا ہے:۔

"علم و شاعری کی قدر اندلس میں اس درجہ تھی کہ عورتیں بھی چار دیواری (حرم) کے اندر محنت و مشقت کر کے علم حاصل کرتی تھیں۔ اور اکثر ان میں سے شاعری اور علمی معلومات میں مشہور تھیں۔ خلیفہ کے قصر لبنا میں ایک لڑکی نہایت حسین اور صرف و نحو۔ شاعری۔ حساب و ہندسہ اور دیگر علوم میں نہایت کامل تھی اس کا خط بھی نہایت پاکیزہ تھا۔ خلیفہ کی راز کی تحریر وہی لکھتی تھی کسی کا شعر اس لڑکی کے کلام کی بندش اور لطافت کو نہیں پہنچتا تھا۔ اس لڑکی فاطمہ کی انشا پردازی بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اور کل علماء اس کے کلام کی داد دیتے تھے۔ یہ لڑکی خلیفہ کے لیے کتابیں بھی نقل کرتی تھی اور اس کے پاس ایک بیش بہا ذخیرہ علمی اور صنعتی کتابوں کا تھا۔ دوسری لڑکی خدیجہ اچھی شاعرہ تھی۔ اور پھر خوب گاتی تھی۔ مریم ایک اور لڑکی علم و شاعری کی تعلیم اشبیلیہ کی خاندانی لڑکیوں کو دیا کرتی اس کی طرز تعلیم نے شہرت پائی تھی۔ اس کے مدرسہ سے بہتیری لائق لڑکیاں نکلی تھیں۔ رضیہ کو (جس کا نام نجم السعید) تھا خلیفہ عبدالرحمٰن نے آزاد کر کے اپنے بیٹے الحکم کو دیا تھا۔ یہ شعر و سخن اور حکایات میں شہرۂ آفاق تھی خلیفہ کے مرنے کے بعد اس نے تمام مشرق کا سفر کیا اور ہر جگہ علماء نے اس کی بڑی قدر کی"۔

اس کے بعد جب ہندوستان کی موجودہ مسلمان عورتوں کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے وہ کس قدر پست حالت میں ہیں نہ تو ان کو مذہبی حقوق حاصل

ہیں اور نہ تمدن و معاشرت کے لحاظ سے زندگی میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ ان کو ایک بے زبان جانور فرض کیا گیا ہے۔ جن کا کام سوائے بچے پالنے کے کچھ نہیں
بتاؤ آج کتنی عورتیں مذہبی حیثیت سے آزاد اور اپنے آپ مختار ہیں میرے خیال میں ایسی بہت کم عورتیں ہونگی۔ جو اپنے مذہبی حقوق سے بہرہ اندوز ہوتی ہوں ہاں ایسی عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگی جو ان سے محروم نظر آئیں گی۔

مذہب کے بعد تعلیم کو لیا جائے تو معلوم ہوگا اس میں بھی ان کی حالت پست ہے تعلیم کے متعلق ہماری خواتین کی تین قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں :-

(۱) جو سرے سے تعلیم یافتہ نہ ہوں۔

(۲) جنہوں نے چند مذہبی کتب پڑھی ہوں۔ اور معمولی اُردو لکھ پڑھ سکیں۔

(۳) جو تعلیم یافتہ ہوں۔

آخر الذکر کی پھر دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ جو صرف ابتدائی یا اوسط درجہ کی تعلیم یافتہ ہوں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہو۔

جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان میں اول اور دوسری قسم کی خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ تیسری قسم کی خواتین کی تعداد بہت کم ہوگی۔ کیا یہ امر ہمارے لئے باعث افسوس نہیں ہے کہ اپنے سلف کے اعلیٰ کارناموں کے پیش نظر رکھنے کے باوجود جہالت کی تاریکی میں پوشیدہ ہوتے جاتے ہیں۔

آج صرف چند ایسی مسلمان خواتین نکلیں گی جو ہندوستان کے لئے باعث فخر ہیں مثلاً بیگم شاہ نواز۔ عطیہ بیگم فیضی۔ شریں ہمایوں مرزا۔ محمدی بیگم مرحومہ۔ فاطمہ بیگم وغیرہ مگر یورپ کے مقابلہ کے لیے یہ کافی نہیں۔

دنیا کی ترقی کے لئے سب سے پہلا زینہ تعلیم ہے جب اس میں ہم یورپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ظاہر ہے کہ دوسرے کسی امر میں ہماری عورتیں یورپ کا مقابلہ

کس طرح کر سکتی ہیں

بتاؤ آج کتنی مسلمان عورتیں قومی خدمت کو انجام دیتی ہیں؟ بتاؤ آج کتنی عورتیں قومی خدمت کو انجام دیتی ہیں؟ بتاؤ آج کتنی عورتیں ہیں جو میدان سیاست۔ صحافت شجاعت۔ اور بہادری میں نام آور ہوئی ہیں۔ بتاؤ آج کتنی عورتیں یورپ کی عورتوں کی طرح اولوالعزم بلند ہمت ہیں۔ اور میدان ترقی و میدان نام آوری میں مردوں کے دوش بدوش گام زن ہیں؟

کیا ہماری عورتیں ان کی طرح جفاکش۔ ان کی طرح محنتی۔ ان کی طرح چست و چالاک ان کی طرح تیز و مستعد ہیں؟ ان کا جواب نفی میں ہوگا۔

یہ امر اور بھی باعث افسوس ہوتا ہے جب کہ خود ہمارے علما یورپین متمدن عورتوں کے لئے پسند کرتے ہیں۔ مگر اس کا علانیہ اظہار نہیں کر سکتے۔ کیا آج عام طور سے کسی کو معلوم ہے مولانا شبلی جیسی ہستی اپنی خانگی زندگی میں عورتوں کے متعلق کیا خیالات رکھتی تھی۔

"کوشش ہونی چاہئے دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے اور بات چیت رفتار گفتار نشست و برخاست مذاق۔ زبان۔ سب الگ ہو جائیں۔ یونہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے

تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے۔ اس بل پر کئے عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو ہیکل ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پڑا نا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان چھوٹی موٹی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں تنومندی۔ دلیری اور دیو ہیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔"

یہ وہ خیالات ہیں جو علامہ شبلی مرحوم نے محترمہ عطیہ بیگم فیضی کے نام خطوط میں ظاہر کیے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں خیال کرو، مولانا عورتوں کے لیے یورپین معاشرت پسند کرتے ہیں وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ عورت اپنی بات چیت گفتار رفتار نشست و برخاست مردوں سے جداگانہ رکھے اور خود نہ کمائے۔ بلکہ وہ یہ پسند کرتے ہیں عورت ہر حیثیت سے مرد ہو جائے۔ نہ صرف اپنی معاشرت میں مردوں کا مقابلہ کرے بلکہ مردوں کی طرح خود کمائے۔

دیکھو یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے علمائے وقت جن امور کو ہماری عورتوں کے لیے اپنی خانگی زندگی میں پسند کرتے ہیں اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔

ہماری موجودہ پستی کا اظہار ایک طویل داستاں ہے مختصر یہ کہ ہماری عورتیں موجودہ حالت میں یورپ کی عورتوں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ نہیں معلوم وہ زمانہ کب آئے گا جب ہماری عورتیں بھی یورپین عورتوں کی طرح میدان ترقی میں مردوں کے دوش بدوش گامزن نظر آئیں گی

(عصمت اکتوبر ۱۹۳۱ء)

ہندوستانی عورت

ہندوستانی عورت ایک ایسا لفظ ہے جس سے بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی جنس ہے مگر جس طرح ہندوستان کو تمام اقلیموں کا معجون مرکب کہا جا سکتا ہے اسی طرح یہاں کی عورتیں بھی مختلف اقسام رکھتی ہیں

دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف قسم کی بوقلمونی اپنا دلچسپ مظاہرہ کرتی ہے۔ اگر ایک طرف قدیم ترین اقوام گونڈ اور بھیل اپنے سادہ اور فطرتی تمدن کے ساتھ آباد ہیں۔ تو دوسری طرف اسی ملک میں اعلیٰ ترین تہذیب و تمدن کا جلوہ بھی ساتھ ساتھ موجود ہے۔

دنیا کے چار بڑے بڑے تمدن ہو سکتے ہیں یعنی برہمنی یا ہندو تمدن مشرق بعیدہ یا ہندوستان کا قدیم بدھی تمدن۔ اسلامی تمدن اور مغربی تمدن ہندوستان اور صرف ہندوستان ہی میں یہ چاروں تمدن ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو موجود ہیں ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کی یہ حالت ہو تو وہاں کے جنس عورت کے مختلف اقسام ہونا ناگزیر ہے۔ مگر یہ حیثیت صرف اسی تمدنی حیثیت سے جداگانہ نہیں ہے بلکہ اس میں بھی تفریق نظر آتی ہے۔ مثلاً اگر ہم ہندو تمدن کو لیں اور ہندو عورتوں پر نظر کریں تو معلوم ہو گا ان کی بھی مختلف تفریق ہو سکتی ہے۔ دوآبہ گنگ کی ہندو عورتیں پنجاب کی ہندو عورتوں سے۔ تلنگانہ کی عورتیں کرناٹک کی عورتوں سے۔ مہاراشٹر کی عورتیں گجرات کی عورتوں سے۔ بنگال کی عورتیں بہار کی عورتوں سے مختلف ہیں۔ ان میں جہاں قدیم ہندو تمدن نظر آئیگا وہاں اس کے ساتھ ہی لباس غذا۔ بات چیت۔ لب و لہجہ۔ رسم و رواج غرض ہر حیثیت سے خلاف نظر آتا ہے،

اسی طرح اگر اسلامی تمدن کو لیا جائے۔ اور اس تمدن کے ساتھ پنجاب شمالی ہند۔ گجرات۔ دکن۔ اور بنگال پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام مسلمانوں پر اسلامی تمدن کا رنگ غالب ہے۔ مگر پھر بھی ان مقامات کے لحاظ سے یہاں کی عورتوں کی زبان گو وہ اُردو ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں فرق ہوگا۔ اسی طرح ان کا لب و لہجہ جدا گانہ ہوگا۔ ان کا لباس مختلف۔ ان کے کھانے پینے مختلف ان کے رسم و رواج جداگانہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی قربت کے باوجود یہ ہی اختلاف نظر آئیگا مثلاً پنجاب اور دوآبہ گنگ کی عورتیں یا دکن (حیدرآباد) اور کرناٹک کی عورتوں سے بحث کریں تو معلوم ہوگا کہ باوجود ان کی قربت کے ہر شے میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ لباس زبان۔ صورت شکل کے لحاظ سے فوراً امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ کہ کون عورت کس ملک سے تعلق رکھتی ہے

یہ ایک دلچسپ بحث ہوگی اگر عصمتی بہنیں جو ہندوستان کے ہر حصہ میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنے یہاں کے رسم و رواج۔ لباس۔ کھانے۔ پینے۔ رہنے سہنے کے متعلق تفصیل کریں۔ خواتین دکن کے لباس کے متعلق ہم نے اپنے ایک مضمون میں صراحت کی ہے۔ جو ساقی میں شائع ہوا ہے۔

مندرجہ بالا تقسیم کے علاوہ ایک اور جزوی تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مشرقیت اور مغربیت کے دلدادہ۔ سلیقہ شعار اور پھوہڑ اطاعت گزار۔ فرمانبردار۔ خود پسند۔ خود بین۔ منکسر مزاج۔ متکبر۔ گورے اور کالے غرض کئی عنوان ہو سکتے ہیں۔ جس کی تفصیلی صراحت کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے وقت اور فرصت درکار ہے۔

ان تمام کے علاوہ ایک اور طرح سے ہم اس کی تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی ہندوستانی عورت بحیثیت بی بی بحیثیت ماں اور پھر بحیثیت بیوہ اور بحیثیت بازاری عورت

اس حیثیت میں اس کے فرائض جداگانہ ہیں۔

اب عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ عورت ہندوستانی عورت نہیں رہتی۔ بلکہ مغربیت کا رنگ و روغن آ جاتا ہے۔ اس کے اخلاق و عادات۔ تمدن تہذیب پر مشرقیت کے بجائے مغربیت چھا جاتی ہے۔ مشرقیت اور مغربیت کی تعریف مؤلف فلسفۂ جذبات نے جو کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"مغرب کی بہترین عورت وہ ہوگی جس کے حسن گفتار حسن رفتار حسن صورت حسن سیرت باکمال رقص کے کارنامے منظر عام پر نمایاں ہوں جس کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوں۔ جس کا تذکرہ لوگوں کے درمیان اور غلغلہ انجمنوں میں بلند ہو جس کی زندہ دلی۔ زمزمہ سنجی نفاست۔ اور شائستگی۔ رعنائی۔ اور دلربائی کے شور عالم میں بلند ہوں"

اور بہترین مشرقی عورت بقول موصوف یہ ہے کہ "جو گھر کی اندرونی زندگی کی مالک ہو۔ خانہ داری کا اعلیٰ سلیقہ رکھتی ہو۔ بچپن میں والدین کی اطاعت اور نکاح کے بعد شوہروں کی خوشنودی کو پروانۂ جنت خیال کرتی ہوں۔ نظام خانگی اس کی ذات سے درست رہے۔ اولاد کی تربیت۔ شوہر کی عزت و محبت بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کی الفت و شفقت کے جذبات لے کر آنکھیں کھولے"

مگر کیا یہ تفصیل اور صراحت صحیح ہے؟ میرا خیال ہے ایک بڑی حد تک ناانصافی سے کام لیا گیا ہے۔ جو صفات مشرقی عورت کے قرار دئے گئے ہیں اور ان کو بہترین ثابت کیا گیا ہے وہی صفات حسنہ بہتر سے بہتر صورت میں یورپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ یورپ یا انگلستان کی عورتوں پر ہم نے عصمت میں[1]

---

[1] یہ مضمون رہبر سفر یورپ کا ایک باب ہے۔

ایک مضمون لکھا تھا۔ خیال تھا اسی کی بموجب ہندوستانی عورت کی شرح کی جائے مگر یہ ہماری معاشرت کے لحاظ سے دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

اس کی تین حالتوں ہیں یعنی دختر۔ بیوی۔ ماں ہیں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اگر بچپن میں والدین کے گھر چار دیواری میں بند ہو کر گھر کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہے اور چھوٹے بھائی بہن کی خدمت کرتی ہے تو جوانی میں میاں کی بی بی ہو کر میکہ سے سسرال آجاتی ہے اور اسی طرح قید و بند کی حالت میں ساس نند کے ساتھ کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور جب صاحب اولاد ہو کر ماں بن جاتی ہے تو بال بچوں کے کام دھندوں سے فرصت نہیں ہوتی۔ اس طرح اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے یا بیوہ ہو جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ بیوہ ہونا ہندوستانی عورت کے لیے ایک بھاری مصیبت کا سامنا ہے کیونکہ وہ بیوگی میں ہی اپنی عمر کاٹ دیتی ہے اس طرح جن کی عمر گزر جاتی ہے ان سے کسی اعلیٰ خدمت یا شہرت اور نام آوری کی امید کرنا فضول ہے ہماری کوئی عورت نہ تو ہوائی جہاز کے سفر[۱] سے نام پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہمالیہ کی بلندی دریافت کر کے مشہور ہو سکتی ہے نہ تو وہ اعلیٰ درجہ کی مصنفہ اور مولفہ بن سکتی ہے اور نہ فلم میں کامیابی کر کے شہرت حاصل کر سکتی ہے

ایک اور شے ہندوستانی عورت کی لازمۂ زندگی ہے اور اس میں وہ ضرور ثابت قدم رہتی ہے۔ یہ شرم حیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی بازاری عورت میں بھی جو شرم و حیا ہوتی ہے وہ یورپ میں نظر نہیں آتی۔ مگر یہ صحیح ہے کہ یورپ کی شرم و حیا کا معیار جدا گانہ ہے۔ ان کی معاشرت کے لحاظ سے تھیٹر میں برہنہ ایکٹ کرنا رقص گاہ میں نیم برہنہ جلوہ گر ہونا اور اس حالت میں غیر مرد کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ مگر ہمارے یہاں یہ بے شرمی اور بے حیائی خیال کی جائیگی (عصمت ۱۹۳۳ء)

---

[۱] مسز حجاب امتیاز نے ہوائی جہاز کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہاشمی

ہمارا لباس

تمدن اور تہذیب کے لوازمات میں لباس بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قوموں کی معاشرت اور تمدن و تہذیب کے مدارج لباس ہی میں مضمر ہوتے ہیں۔ ستر پوشی۔ یکسانیت نزاکت۔ نفاست۔ ہر ایک سے اس قوم کی ترقی اور تہذیبی حالت منکشف ہوتی ہے

جب کوئی قوم اپنے تمدن سے انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے تو اس کا لباس اسی قدر بہنگی اور نزاکت اور نفاست میں ترقی کرے گا۔ غرضکہ قوم کی ترقی کا ایک ممیز آلہ لباس ہے۔

ہندوستان میں جہاں بیسیوں اقوام آباد ہیں اور صدہا زبانیں مروج ہیں ان کے لباس کی بھی یہی حالت ہے۔ صرف مسلمانوں کو لیا جائے اور ان کی مشترک زبان اردو قرار دی جائے۔ مگر پھر بھی لباس میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ پنجاب کے مسلمانوں کا عام لباس کچھ اور ہے اور حیدرآباد کا کچھ اور۔ دوآبہ گنگا اور جمنا کے بسنے والوں کا لباس کچھ اور ہے تو مدراس کے مسلمانوں کا کچھ۔ بنگال کے مسلمانوں کا لباس بمبئی اور گجرات کے مسلمانوں سے نہیں ملتا۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے گزشتہ اور موجودہ لباس کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو خاصی ضخیم اور دلچسپ ہو سکتی ہے۔

یہاں اس امر کا تو موقع نہیں کہ مذکورہ بیان کی صراحت اور وضاحت کی جائے۔ ۸۹
کیونکہ اس کے لئے بہت بڑے معلومات کی ضرورت ہے۔ البتہ یہاں جنوبی ہند کے مسلمانوں کے لباس کی کچھ صراحت کی جاتی ہے۔[1]

جنوبی ہند کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری ہی میں قائم ہو چکے تھے۔ سواحل کرناٹک اور ملیبار پر عرب تجار اور مبلغ اپنی تجارت اور تبلیغ دین کی غرض سے

---
[1] اس سے صرف جنوبی ہند کے مسلمانوں کا لباس مقصود ہے۔

آتے تھے اس طرح شمال کی جانب سے مسلمان فاتح کے ہمراہ قدم رکھنے کے صدیوں پیشتر جہازوں کی راہ سے ساحلِ ہند پر وہ اپنے قدم جما چکے تھے۔ اور ان کی مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔

اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے تحفۃ المجاہدین (تاریخ ملیبار) تاریخ فرشتہ سفرنامہ ابن بطوطہ اور "عرب و ہند کے تعلقات"، وغیرہ کتابوں سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔

جن مسلمانوں نے جنوبی ہند کے ساحل پر قدم رکھا تھا وہ اکثر شرفاء عرب اور سادات بنی فاطمہ اور ہاشمی النسل تھے۔ اور یہ اپنے اس وقت کے تمدن کے موافق اپنی معاشرت کے مطابق۔ عمامہ۔ قبا۔ قمیص۔ پائجامہ لنگ کا استعمال کرتے تھے۔ عورتوں میں قمیص پائجامہ۔ سینہ بند اور اوڑھنی مستعمل تھی۔

یہاں (سواحل ہند) کے باشندوں کا لباس اس سے بالکل جداگانہ تھا مردوں اور عورتوں کے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ رہا کرتا تھا۔ اور مرد عموماً دھوتی اور عورتیں ساڑھی کا استعمال کرتی تھیں۔ البتہ دولتمند قیمتی اور غریب موٹا سوتی لباس پہنا کرتے تھے۔

جب ایک قوم دوسری قوم میں بود و باش کرتی ہے تو یہ ناگزیر ہے۔ کہ ایک قوم کے تمدنی لوازمات دوسری قوم کے تمدن میں شامل نہ ہو جائیں اور فاتح کا لباس مفتوح قوم میں مروج نہ ہو جائے۔ عربوں نے جب شام ایران اور مصر کو فتح کیا تو بہت ہی جلد وہاں کا قدیم تمدن معدوم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ عربی تمدن نے لے لی مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں نہ تو خالص عربی تمدن کا رواج ہوا اور نہ ہندی تمدن بالکل زائل ہو گیا۔ بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک علیحدہ تمدن قائم ہو گیا۔ اور جنوبی ہند کی اسلامی سلطنتوں۔ بہمنیہ۔ عادل شاہیہ قطب شاہیہ وغیرہ کے زمانہ میں گویا اس

متمرجحہ تمدن نے اپنی انتہائی ترقی حاصل کرلی تھی۔ اور عام طور سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا خصوصاً درباری لباس اور اعلیٰ سوسائٹی کا لباس قریب قریب یکساں تھا۔ البتہ سر کے لباس میں کچھ فرق ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں جب وجیانگر میں ہندوؤں کی زبردست سلطنت قائم ہوگئی تو جنوبی ہند کے انتہائی مقامات (احاطہ مدراس) کے مسلمانوں میں ہندی لباس نے زیادہ جگہ لے لی تھی۔

عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں جو لباس مروج تھا۔ اس کی وضاحت ہم کو قدیم آرٹ کے نمونہ سے بخوبی واقف کرسکتی ہے۔ یہاں بعض امور کی صراحت کی جاتی ہے۔ مسلمان مرد لمبی قبا تنگ آستین کی استعمال کرتے تھے۔ جس کے بیچ کا حصہ گھیردار ہوتا تھا۔ یہ عموماً سفید ململ کی ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایک نیم آستین قبا اس پر ہوتی تھی۔ یہ عموماً رنگین اور قیمتی کمخواب مخمل وغیرہ کی ہوا کرتی۔ پائجامہ کبھی تنگ اور کبھی گھیردار استعمال ہوتا تھا۔ عام طور پر عمامہ باندھا جاتا تھا جس کو کبھی پہنے بھی ہوا کرتے تھے۔ جنگ کے وقت خود اور بکتر کا بھی رواج تھا۔ عورتوں کے لباس میں لہنگا۔ دامنی اور چولی کا استعمال تھا۔ بعض وقت ایسی انگیا استعمال کی گئی ہے جس سے سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا رہتا تھا۔ عورتوں کا یہ لباس زریں ہوتا تھا۔ عموماً شوخ اور گہرے رنگ کا رواج تھا جو پائیدار خیال کیا جاتا تھا۔

ایک زمانہ دراز تک تمام جنوبی ہند میں ایک ہی لباس پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد یہاں بھی تفریق ہوگئی اور تقریباً دو حصے ہوگئے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ صراحت کی جائے۔

احاطہ مدراس و میسور:۔ ارکاٹ (مدراس) میں جب روسائے ارکاٹ حکمراں تھے تو عام طور سے مردوں کے لباس میں حسب ذیل اشیاء نظر آتے تھے

عمامہ (سفید) جامہ (سفید ململ کا) تہمان (مشروع یا کمخواب وغیرہ) اوپر سے شال بھی اوڑھی جاتی تھی۔ بعض قدیم عربی خاندانوں میں عربی لباس شایا یا جبہ وغیرہ استعمال ہوتا تھا۔

عورتوں میں عام طور سے ہندوی لباس مروج تھا اور وہ شوخ رنگ ململ وغیرہ کی دامنی۔ چولی اور لہنگا (مشروع کمخواب وغیرہ) کا استعمال کرتی تھیں۔ بعض جگہ عربی لباس بھی تھا۔

شادی بیاہ کے موقع پر مردوں کے لباس میں بجائے سفید جامے کے رنگین اور زریں کام کا جامہ استعمال ہوتا تھا۔ اور عمامہ بھی زریں ہوتا تھا۔ دلہنوں کے لیے پشواز اور چوحاشیہ جو قیمتی مصالحہ سے بنائی جاتی تھی استعمال کی جاتی تھی

میسور میں بھی عموماً یہی لباس تھا۔ مگر ٹیپو سلطان کے زمانہ میں چولی یا انگیا کی آستینیں قانوناً لمبی کی گئی تھیں اور یہ قانون ہندو مسلمانوں سب کے لیے تھا۔ چنانچہ آج تک بھی میسور میں نیچ اقوام لمبی آستین کی انگیا استعمال کرتے ہیں۔

امتداد زمانہ سے اگرچہ مردوں کے لباس میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے مگر احاطہ مدراس وغیرہ کی عورتوں میں قدیم لباس کی جھلک اب تک باقی ہے۔ فی زمانہ جو لباس اس طرف مستعمل ہے اس کی صراحت کی جاتی ہے

(۱) مردوں کا لباس اکثر و بیشتر حسب ذیل ہوتا ہے:۔

(الف) مکمل انگلش لباس (

(ب) عمامہ (بلا شملہ) یا کلاہ رومی۔ شیروانی مگر لمبی قمیص۔ پائجامہ۔ زیادہ تنگ نہ زیادہ فراخ ۔

(ج) عمامہ یا مخملی ٹوپی قمیص۔ کوٹ یا صدری۔ پائجامہ یا لنگ

(۲) عورتوں کا لباس

(الف) مکمل پارسی لباس

(ب) ساڑی۔کرتی بلاآستین چولی۔

(ج) لہنگا دامنی چولی

بعض گھرانوں میں عورتوں کے لئے بھی مکمل یورپین لباس مروج ہے

قلمرو آصفیہ و سلطنت حیدرآباد۔ یہاں کے لباس میں قطب شاہی دور کے بعد شمال کے مغلیہ لباس کی جھلک نظر آتی تھی۔ مگر اس کے بعد بتدریج تغیر ہوتا گیا مردوں کے لباس میں عمامے اور مختلف وضع کے دستار استعمال ہونے لگے۔ سفید جاموں کا گھیر کم ہوتا گیا۔ اور انگرکھا بھی مستعمل ہونے لگا۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۲۰۰ھ کے اواخر سے کلاہ رومی اور شیروانی کا رواج ہونے لگا۔ مگر قدیم شیروانی موجودہ شیروانی سے لمبی ہونے کے علاوہ وضع اور قطع میں بھی بڑا فرق تھا۔

عورتوں کے لباس میں اول تو لہنگا اور دامنی اور چولی کا استعمال تھا۔ مگر اس کے بعد پائجامہ استعمال ہونے لگا۔ جو نہ زیادہ تنگ ہوتا تھا اور نہ زیادہ فراخ اس کے ساتھ دوپٹے اور کرتی اور چولی کا رواج تھا پائجامہ ہمرو یا مشروع گلبدن کمخاب وغیرہ کا ہوا کرتا ہے۔ دوپٹہ اکثر ململ اور ریشمی ململ وغیرہ کا ہوتا۔ اکثر گہرے رنگ کا استعمال تھا۔ چولی اور کرتی جالی کی بنائی جاتی تھی اس کے بعد بجائے کرتی (یا بلاآستین) کرتے کا رواج ہوا۔ جو پہلے تو زیادہ دراز نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کے بعد زیادہ دراز کا رواج ہوا۔

شادی بیاہ کے موقع پر اول تو زریں پشواز اور بنگلائی پہنی جاتی تھی مگر بتدریج اس کا رواج موقوف ہو کر شادی بیاہ کے موقع پر بھی وہی پائجامہ اور دوپٹہ کا رواج ہوا۔ اس کے بعد بتدریج ساڑھی کا آغاز ہوا۔ اور اس کے ساتھ قمیص اور بلوس بھی مروج ہونے لگی۔ آج بہت بڑا حصہ اسی کو استعمال کرتا ہے۔

زرنی برق مصالح دار دوپٹے غائب ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے بجائے زریں ساڑھی آگئی ہے۔ مگر سوزِ دوپٹہ کا رواج باقی ہے۔ معدوم نہیں ہوگیا۔

آج کل جو لباس مردوں اور عورتوں میں مروج ہے اس کے اقسام حسب ذیل ہیں

مردوں کا لباس

(۱) رومی ٹوپی۔ ایرانی ٹوپی۔ تسلہ۔ دستار۔ ہیٹ۔ کشتی نما ٹوپی

(۲) شیروانی۔ کوٹ

(۳) قمیص۔ کرتا۔

(۴) پائجامہ (روہر انگ) فراخ چوڑی دار۔ پتلون۔

(۵) بوٹ۔ شوز۔ چپل۔ چروا

عورتوں کا لباس

(۱) بال کاٹنے کا آغاز ہوگیا ہے۔

(۲) ساڑھی۔ دوپٹہ

(۳) قمیض۔ بلوس۔ کرتہ۔ کرتی۔ بلاآستین

(۴) پائجامہ

(۵) شوز۔ چپل۔ چروا

(۶) چولی۔ بنین۔ چست۔ برسٹ

شیروانی سوتی۔ ریشمی اور اونی کپڑے کی ہوتی ہے۔ اس کی وضع اور قطع ہندوستان بھر میں مشہور و معروف ہے۔ اکثر شیروانی کے ہمرنگ پینیا کا استعمال ہوتا ہے۔ شیروانی کی گھنڈیاں بھی ہم رنگی رکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ریشمی کپڑا اس کے لئے استعمال ہوا کرتا ہے۔ مگر اب عام طور سے رنگین ریشمی کپڑے کی شیروانی معیوب تصور ہوتی ہے۔ صرف دولھا کی حد تک اب بھی اس کا رواج ہے۔ بلکہ اکثر کمخواب اور مشجر کی شیروانی استعمال کی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کم از کم اور دس پندرہ سال اس کا رواج رہیگا۔

موسم گرما میں قسم قسم کی سلک کی شیروانیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ سفید برک اور الپاکی شیروانیاں بھی مروج ہیں۔ آج کل کھدر کی شیروانی بھی نظر آتی ہیں۔ مگر شاذ۔

عورتوں میں سوتی اور ریشمی اور زریں کپڑوں کا رواج ہے۔ مگر عام طور سے شوخ اور گہرا رنگ پسند نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صدفیانی اور ہلکا رنگ پسند ہوتا ہے، ساری کے رنگ اور اکثر اوسی کپڑے کی قمیص یا بلوس استعمال کی جاتی ہے۔ پائتابہ اور شوز بھی اسی رنگ کے ہونے لگے ہیں۔ بلکہ دستی بھی اور چوڑیاں بھی اسی رنگ کی پہنی جاتی ہیں۔

کلابتون کے کام کی ریشمی اور مہین ساڑھی کے ساتھ ساتھ بنارس کی وزنی اور زریں ساڑھی بھی استعمال کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں آجکل مردوں اور عورتوں میں جو لباس حیدرآباد میں مروج ہے وہ نہایت خوبصورت موزوں اور مناسب ہے۔ میرا خیال ہے عام طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہی لباس بہتر ہوسکتا ہے، دعوت شادی بیاہ کے موقع پر عورتوں سے قطع نظر مردوں کی رنگ برنگ کی شیروانی (اونی اور سلک کی) اگرچہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یورپ کی طرح اگر یک ساں رنگ کی یکسانیت ہوجائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

عورتوں کے لباس میں اہل یورپ کی طرح نیم آستین اور بلا آستین بلوس کا رواج ہوچلا ہے۔ اور اس وضع کی بلوس مقبول ہوتی جارہی ہے اس میں شک نہیں خوبصورتی کے اعتبار سے اس کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

(ساقی فروری سنہ ۱۹۳۲ء)

مسلمان عورتوں کا لباس

رسالہ شہاب بابتہ آذر ۱۳۴۴ ف میں مولوی حافظ محمد مظہر صاحب کا قابل قدر مضمون "ہندوستان کی مسلمان عورتوں کا لباس" کے عنوان سے شائع ہوا ہے مولوی صاحب نے بہ لحاظ یکسانیت۔ ارتقاء تمدن۔ سہولت اور آسائش۔ خوش نمائی و زیبائش۔ سرپرستی صنعت ملک کفایت۔ و پائیداری عورتوں کو پائجامہ اور دوپٹہ کے استعمال کرنے کی رائے دی ہے۔

آج سے تقریباً دو سال قبل راقم کا ایک مضمون "ہمارے خواتین کا لباس" کے عنوان سے "ساقی دہلی" میں شائع ہوا ہے۔ میں نے ساڑھی کے متعلق رائے دی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اپنے دلائل بیان کریں مولوی صاحب کے پیش کردہ اصول پر اظہار خیال کی ضرورت ہے۔

بیشک مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کی بود و باش ہے۔ مگر جس طرح عورتوں کے لباس میں یکسانیت نہیں ہے۔ اسی طرح مردوں کے لباس کی حالت ہے۔ آج مسلمانوں کا بڑا حصہ یورپین لباس کا عادی ہے۔ مگر پھر بھی ان کے لباس میں یکسانیت نہیں ہے جب مردوں کے لباس کی یہ حالت ہے تو عورتوں کو یکسانیت کے لحاظ سے اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پائجامہ اور دوپٹہ کا استعمال کریں۔ علاوہ ازیں آج ٹرکی۔ ایران۔ عراق۔ حجاز اور مصر میں بھی لباس کی یکسانیت باقی نہیں۔ یورپین لباس کا استعمال ہو رہا ہے۔ تو پھر یکسانیت کا خیال کہاں باقی رہتا ہے۔

تمدن کے لوازم میں بیشک بغیر سئے ہوئے لباس سے سئے ہوئے لباس کو ترجیح ہے۔ مگر بغیر سئے ہوئے لباس میں بھی مدارج ہیں۔ ایک کپڑا لپیٹ لینا

اور آج کل کی طرح ساڑھی کا پہننا بڑا فرق رکھتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی تمدّن اور جہالت کا ابتدائی دور دائرہ کی شکل میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً تمدن کے پہلے برہنگی تھی اور تمدن کے ساتھ ساتھ لباس میں زیادتی ہوتی گئی۔ مگر اب انتہائی تمدن کے زمانہ میں برہنگی کی طرف قدم بڑھایا جا رہا ہے۔ خصوصاً عورتوں کا حُسن اس وقت ہی نمایاں ہوتا ہے جب کہ ان کے جسم کا ایک حصہ لباس کی منت پذیری سے بے نیاز ہو۔ اس لئے یہ نہیں کیا جا سکتا کہ پائجامہ پہننا تمدن کی دلیل ہے۔ اور ساڑھی میں تمدن کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔

سہولت اور آسایش کے جو اسباب حافظ صاحب نے لکھے ہیں وہ پائجامہ اور دوپٹہ سے زیادہ ساڑھی میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہی سہولت اور آرام ساڑھی کے اُتارتے اور "پیٹی کوٹ" میں حاصل ہو سکتے ہیں اور عورت ہرگز عُریاں نہیں ہو سکتی بے ستری کا موقع سوتے وقت اُس وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ چڈی کا استعمال نہ ہو۔ آج کل ساڑی کے ساتھ ساتھ "پیٹی کوٹ" اور "چڈی" کا استعمال عام طور سے ہوتا ہے۔ جس کے باعث بے ستری کا کوئی شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

خوشنمائی اور زیب و زینت ہر شخص کے خیال میں علیحدہ علیحدہ ہے کوئی ساڑھی اور جمپر کو خوش نمائی خیال کرتا ہے۔ کوئی پائجامہ اور دوپٹہ کو۔ اس لئے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

آج کل ساڑھی یا قمیص یا جمپر ایک ہی رنگ بلکہ ایک ہی کپڑے کے بنائے جاتے ہیں جس کے باعث خوش نمائی زیادہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ دیگر لباس بھی اسی رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ صورت پاجامہ اور دوپٹہ میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان وجوہ سے خوش نمائی ساڑھی میں زیادہ ہے۔ نہ کہ پائجامہ اور دوپٹہ میں

ملکی صنعت و حرفت کی قدر جس طرح پائجامہ اور دوپٹہ میں ہو سکتی ہے۔ اسی

طرح ساڑھی میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس اصول پر زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ریشمی کپڑا جو دوپٹہ کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے وہی ساڑھی کے لئے کام آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نارائن پیٹھ۔ پٹن وغیرہ کی ریشمی اور زریں ساڑیاں ملکی صنعت وحرفت کو ہر طرح فروغ دے سکتی ہیں۔

کفایت اور پائیداری بھی ساڑھی میں زیادہ ہے۔ پائجامہ کسی وقت بھی نکالا نہیں جاسکتا۔ اس لئے زیادہ استعمال سے جلد تبدیلی کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ساڑھی سوتے وقت علیحدہ کی جاسکتی ہے اور "پٹی کوٹ" میں آرام کر سکتے ہیں اور یہ پیوند لگا ہوا بھی استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ ساڑھی کے اندر ہونے سے نظر نہیں آتا۔ اور پھر پائجامہ کے ساتھ قمیص یا کرتہ طویل ہونا ضروری ہے۔ اس کے برخلاف ساڑھی میں اس کی ضرورت نہیں جمپر کا طول زیادہ نہیں ہوتا۔ غرض اس طرح کفایت بھی ساڑھی میں ہے۔ نہ کہ پائجامہ اور دوپٹہ میں

اسی طرح مولوی صاحب نے جن اصول کے تحت پائجامہ اور دوپٹہ کی رائے دی ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہیں اس کے برخلاف جو امور ساڑھی کے استعمال میں قابل لحاظ ہیں، ان کی یہاں صراحت کی جاتی ہے جن سے ہمارے دعوے کی پوری تائید ہوتی ہے۔

۱۔ آج کل تمام دنیا میں مسئلہ زر خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہر طرف روپیہ کی قلت ہے، ایسی صورت میں وہی لباس زیادہ مفید اور زیادہ سودمند ہو سکتا ہے جو بہ کفایت تیار ہو جائے اس اصول کے تحت اگر ہم حساب کریں مثلاً

پائجامہ	کم از کم ایک روپیہ	اس کے برخلاف	
کرتہ جو پائجامہ کے لحاظ سے طویل ہونا چاہئے	آٹھ آنہ	ساڑھی دو روپیہ	عہ
دوپٹہ	دو روپیہ	کرتہ یا قمیص چھ آنہ	۶/
		پیٹی کوٹ وا چڈی وغیرہ	ایک روپیہ
جملہ	۳/۸	جملہ	۳/۶

ظاہر ہے وہی لباس مفید ہوگا جو کم خرچ ہو۔ اس لئے ساڑی کو ترجیح دینی لازمی ہے۔

۲۔ستر پوشی ساڑی پیٹی کوٹ اور چولی میں زیادہ ہوتی ہے۔خواہ خلوت ہو یا جلوت جس طرح ساڑی مفید ہے اس طرح دوپٹہ اور پائجامہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔زیب وزینت اور خوبصورتی اور خوش نمائی ہر شخص کے خیال سے علیحدہ ہے مگر پھر بھی ریشمی ساڑی اور جمپر میں کوئی عورت ملبوس ہو اور جمپر بلا آستین کا ہو اور گداز جسم کے سڈول ہاتھ پورے برہنہ ہوں تو عورت کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اس طرح ساڑی میں ہی خوبصورتی زیادہ ہوتی ہے۔

۴۔لباس تمدن کے لوازمات سے ہے۔مذہب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ہمارے ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں ہندو پارسی اور عیسائی یہودی سب ہی ساڑھی میں ملبوس ہوتی ہیں اس طرح ساڑی گویا ہندوستان کا قومی لباس ہے۔ اس لئے مسلمان عورتوں کو بھی اپنی دوسری بہنوں کا ساتھ دینا ضروری ہے۔جب تک ایک ملک میں رہنے والی قوم ایک زبان نہ بولے اور ایک تمدن نہ ہو کوئی ملک ترقی نہیں کرتا۔

مذہب اسلام ساڑی کا مخالف اور پائجامہ اور دوپٹہ کی طرفداری نہیں کرتا اس لئے ہم کو تمدن خصوصاً لباس میں اپنے ملک کی پیروی کرنی چاہیئے۔

(رسالہ شہاب بابت دسمبر ۱۹۴۶ء)

MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH

ہماری رسوم شادی میں اصلاح کی ضرورت

عالم اسلامی کے قطع نظر ہندوستان کے مختلف حصوں میں شادی بیاہ میں جس قدر رسوم ہوتی ہیں وہ بڑی حد تک علیحدہ ہیں۔ جو رسوم شمالی ہند میں ہوتی ہیں وہ جنوب میں نہیں ہوتیں۔ مگر بعض رسومات ایسے ہیں جو سارے ہندوستان میں مشترک قرار دی جاسکتی ہیں۔

جو مسلمان شمال سے ہندوستان میں داخل ہوئے اُن میں زیادہ تر مغل۔ ترک اور پٹھان تھے۔ مگر اس کے برخلاف جنوبی ہند میں زیادہ تر عرب تجار اور مبلغین نے قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد شمالی ہند اور دکن میں مسلمانوں کے مختلف خاندانوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جہاں تمدن اور تہذیب کے مدارج طے ہوئے۔ ان خاندانوں کے بانی ترک۔ مغل۔ پٹھان ایرانی اور ہندوستان کے نومسلم سب ہی شامل تھے۔ اور اسی طرح یہاں کے امرا اور علماء اور فضلا کی حالت تھی۔ جن میں ہر ملک و دیار کے لوگ شامل تھے۔ ان کے امتزاج سے جو تمدن قائم ہوا اس میں جہاں ان کے آبائی رسم و رواج کا آنا ضروری تھا۔ وہاں دیسی ہندوؤں کے رسم و رواج کا داخل ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے ہر ایک رسم شادی بیاہ یہاں تک کہ مذہبی امور میں بھی بعض چیزیں شامل ہوگئیں اور اس طرح اسلامی تمدن و تہذیب کا جزو بن گئیں کہ گویا خاص مسلمانوں ہی کی معلوم ہونے لگیں۔

آج سے تقریباً سات سو سال پیشتر یہاں مسلمانوں کی شادی کے موقع پر جو رسوم ہوتی تھیں اس کی مختصر وضاحت سفرنامہ ابن بطوطہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ امیر سیف الدین کی شادی (جو سلطان محمد تغلق کی دختر سے ہوئی) اس کی جو تفصیل درج کی ہے اس کا انتخاب

حسب ذیل ہے :-

" ..... انھوں نے اسے چوکی پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی اور باقی عورتیں اس کے سر پر کھڑی ہو کر ناچتی گاتی رہیں ... اس ملک کا دستور ہے کہ جس مکان سے دولہا دلھن کو اپنے گھر لاتا ہے۔ اس مکان کے دروازہ پر دلہن کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور جب دولھا کی جماعت آتی ہے تو ان کو داخل ہونے سے روکتی ہیں اگر وہ غالب ہو جاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں اور اگر مغلوب ہو جاتے ہیں تو ان کو ہزار دینار روپیہ انعام دینے پڑتے ہیں۔ نماز مغرب کے بعد امیر کے پاس نیلے ریشم کی خلعت لائے جو زربفت کی بنی ہوئی تھی .... پھر امیر سیف الدین نے اپنے ساتھیوں اور غلاموں کو ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ پھر ایک چیز جو تاج کے مشابہ تھی اور جو چنبیلی اور نسرین اور رائے بیل کے پھولوں کی ہوتی ہے اور جس کی جھالر منھ اور سینہ پر لٹکتی ہے لائے اور امیر کو کہا اس کو سر پر رکھو۔ امیر نے انکار کیا کیونکہ وہ عرب کا صحرائی تھا۔ میں نے کہا امیر کا کہنا مان لو اور اس کو قسم دلائی تو اس نے سر پر رکھ لیا ۔.... امیر کا گھوڑا دلہن کے منبر تک آیا۔ وہاں آکر امیر گھوڑے سے اُترا اور منبر کی پہلی سیڑھی کے پاس کھڑے ہو کر زمین بوسی کی۔ اس وقت دُلہن کھڑی ہو گئی پھر دُلہن نے اپنے ہاتھ سے امیر کو پان دیا۔ اور امیر دُلہن سے ایک سیڑھی نیچے بیٹھ گیا اور اس کے ساتھیوں پر درہم و دینار نثار کئے گئے ...... عورتیں تکبیریں کہتی تھیں اور گاتی بھی جاتی تھیں۔ پھر امیر کھڑا ہوا اور اپنی دُلہن کا ہاتھ پکڑ کر منبر سے نیچے اترا اور وہ اس کے پیچھے ہولی امیر تو گھوڑے پر سوار ہو گیا اور دُلہن ڈولے میں بیٹھ گئی" ص۲۵ و ص۱۲۶

ہمارے تمدن معاشرت اور رسم ورواج میں جو جو امور ہندوؤں سے آئے ہیں ان کی تفصیل طوالت کی موجب ہے۔ اور یہاں ان کی صراحت بھی منظور نہیں ہے

ہماری شادیوں میں جو جو رسومات آج سے پچیس تیس سال پہلے ہوا کرتے تھے اگرچہ وہ آج ملک کے بڑے حصہ میں رائج نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی بعض خاندانوں میں قدیم رسومات کی پابندی ہوتی ہے۔ اور جہاں رسومات سے کنارہ کشی کی گئی ہے۔ وہاں بھی کئی ایک رسوم ایسے ہوتے ہیں جن کو ترک کرنا ہی مناسب ہے

مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں پوری طرح یہاں کے رسومات سے واقف نہیں ہوں۔ کیونکہ تقریباً ۸۰ سال سے ہمارے خاندان میں شادی بیاہ میں رسومات بالکل نہیں ہوتے اور ایک خاص ضابطہ اور دستور العمل کے ماتحت صرف اُن ہی امور کی پابندی کی جاتی ہے جو یا تو سنت نبوی کی رُو سے ضروری ہیں یا مذہب کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اور غیر ضروری اسراف اور فضول خرچ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہمارے خاندان میں نہ تو غیر کفو سے لڑکی لی جاتی ہے اور نہ دی جاتی ہے اس لئے بھی رسومات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہو سکتا۔ تاہم عام طور سے جو رسومات مشہور و معروف ہیں اس کی صراحت کی جاتی ہے۔

شادی کے رسومات میں سب سے پہلے منگنی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ انتخاب زوجین کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ مگر ہماری معاشرت کے لحاظ سے اس کی جیسی کچھ حالت ہے وہ بیان کی محتاج نہیں اور نہ سر دست اس میں کچھ اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس مسئلہ کو میں نظر انداز ہی کرتا ہوں کیونکہ اس پر بڑی بحث کی ضرورت ہے۔

منگنی کے بعد شادی کی ابتدا منجھے سے ہوتی ہے۔ کہیں تو عقد کے ایک دو دن پہلے کہیں اس سے زیادہ چار پانچ دن۔ بلکہ ایک ہفتہ پہلے بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ دولھا دلہن اپنے اپنے مکانوں میں ایک مخصوص کمرہ میں رکھے جاتے ہیں اور زرد لباس پہنایا جاتا ہے۔ دولھا تو خیر وہ اپنی ضروریات کے لئے آتا جاتا ہے۔ اس کے لئے صرف رات میں اس خاص کمرہ میں سونا لازمی ہوتا ہے مگر دلہن

عزیب اس کمرہ سے باہر بھی نہیں جا سکتی۔ یہ رسم جس قدر غیر ضروری اور تکلیف ہے وہ ظاہر ہے۔ اس رسم کے موقع پر نہیں معلوم اور کیا کیا جزئی رسومات ہوتے ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی کہ اس رسم کو جائز رکھا جائے۔ اس مخصوص نیند سے دلہن کی صحت پر بھی بُرا اثر ہوتا ہے

منجے کے بعد ساچق کی رسم ہوتی ہے جب دولھا کی جانب سے دلہن کے لیے لباس عروس جاتا ہے اور دولھا کی طرف سے عورتیں دلہن کے مکان کو جا کر رسومات انجام دیتی ہیں۔ عموماً بڑی رات کو اس سے فراغت ہوتی ہے۔ اس کے دوسرے دن مہندی کی رسم ہوتی ہے یعنی دلہن کی جانب سے دولھا کے لیے لباس، عروسی آتا ہے۔ اور دلہن کی اقربا مستورات دولہا کے مکان کو آکر رسم کرتی ہیں۔ ان دونوں رسومات میں کافی اصلاح کی ضرورت ہے صرف لباس کا روانہ کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ دیگر امورات ترک کرنے کے قابل ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اور غیر ضروری اخراجات طرفین کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

مہندی کے بعد شب گشت ہوتی ہے۔ عقد کی رات (یعنی جس رات کی صبح عقد ہوتا ہے) دولہا کے پاس ضیافت ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر دولہا تمام رات شب بیدار رہتا ہے۔ صبح صادق سے دولھن کے مکان کو روانگی کی تیاری ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر صبح سویرے دولھا دلہن کے مکان کو روانہ ہوتا ہے۔ دس پندرہ سال قبل تو سب گھوڑے پر جاتے تھے مگر اب زیادہ تر موٹر استعمال کی جاتی ہے۔ مگر موٹر سے آگے بھی باجا ہوتا ہے اور موٹر پھولوں سے آراستہ کی جاتی ہے۔

جب دولہا دلہن کے مکان کو پہنچ جاتا ہے تو دلہن والے مکان کا دروازہ بند کر دیتے ہیں جس کو "دبنگانہ" کہتے ہیں۔ بعض سالے صاحب بغیر کچھ لئے دروازہ نہیں کھولتے۔ بعض مرتبہ آدھ آدھ گھنٹہ اس تکرار اور دل لگی

مذاق میں گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد دولھا کو زنانہ پر لے جاتے ہیں اور دُلہن پر چاول پھینکے جاتے ہیں۔ اور بعض جگہ غالباً دُلہن کی صورت بھی بتائی جاتی ہے یہ دونوں رسومات ترک کرنے کے قابل ہیں جس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی

شب میں جلوے کی رسم ادا ہوتی ہے۔ اور عموماً میراثن یہ رسم ادا کرتی ہے نہیں معلوم کیا کیا لغویات اس وقت ہوتے ہیں۔ مگر تمام رسومات کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ دولھا کی سبکی کرائی جائے۔ اور مسخرہ بنایا جائے۔ ان رسومات میں بڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تمام لغو رسول کو ترک کر دینا بہتر ہے۔

جلوہ کے بعد بازگشت ہوتی ہے۔ دولہا دُلہن کو لے کر اپنے مکان کو روانہ ہوتا ہے جہیز کا سامان بھی عموماً ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر موٹر کے ساتھ ناچنے والے طرب وغیرہ ہوتے ہیں۔ راستہ میں آتش بازی ہوتی ہے غرض دولہا کو اپنے مکان پہنچنے تک دس گیارہ بلکہ بعض مرتبہ اس سے زیادہ ہی وقت ہو جاتا ہے۔ اب پھر دولہا کے مکان میں رسومات ہوتے ہیں مثلاً دودھ سے دولہا دُلہن کے پیر دھلائے جاتے ہیں۔ اور بکرے کا خون دلہن کے پیر کو لگایا جاتا ہے نہیں معلوم اور کیا کیا رسوم ہوتے ہیں یہ سب رسومات لغو اور ترک کرنے کے قابل ہیں جس سے کوئی فائدہ نہیں۔

دوسرے دن شام کو چوتھی کی رسم ہوتی ہے۔ عموماً بڑی رات کو دولہا معہ دوست احباب عزیز و اقارب دُلہن کے مکان کو آتا ہے اور یہاں بیسیوں رسومات ادا ہوتے ہیں۔ دولہا کو خوب بنایا جاتا ہے۔

اکثر اصحاب کے پاس ان غیر ضروری رسومات تو ادا ہوتے ہیں مگر ولیمہ جو سنت النبی ہے غائب کر دیا جاتا ہے۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام

ہے کہ شادی جیسی مذہبی رسم میں غیر ضروری رسومات تو لازمی طور پر ہوں
ولیمہ جو شادی کے لئے نہایت ضروری ہے نہیں ہوتا۔

یہ ایک عربی مثل ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم۔"
اس نقطہ نظر سے جب ہم ہمارے شاہزادہ ولیعہد نواب اعظم جاہ بہادر
اور نواب معظم جاہ بہادر کی شادیوں پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا
ہے کہ یہاں نہ تو منجھے کی رسم ہوئی ہے اور نہ ساچق اور ہاتھ کی مہندی
کے نہ تو جلوہ کی غیر ضروری رسوم ہوئیں اور نہ چوتھی کی رسم۔

اس زریں مثال کو پیش نظر رکھ کر بہتر ہوگا کہ ہمارے برادران
وطن بھی غیر ضروری اور لغو رسومات کو ترک کردیں اور اس کے بجائے
سنت النبی کی پیروی کریں۔

(نظام گزٹ مبارکباد نمبر)

خواتین حیدرآباد کی معاشرت

کہنے کو تو ہندوستان ایک ملک کا نام ہے مگر اس کے مختلف حصّے اپنے تمدن اور معاشرت رسم و رواج کے لحاظ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجاب کی طرز معاشرت اور رسم و رواج ممالک وسط ہند سے جداگانہ ہیں تو دکن اور بنگال علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ گجرات کی معاشرت ایک ہے نرالا جو "تانہ کی جدا غرض ہندوستان کا ہر حصہ ایک علیحدہ معاشرت کا حامل ہے۔ جنوبی ہند میں اگرچہ بمبئی۔ حیدرآباد اور مدراس ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود جس طرح طرز معاشرت کا فرق ہے وہ درحقیقت حیرت انگیز ہے۔

یہاں ہم حیدرآباد کی خواتین کی معاشرت کے بعض پہلو پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ دلچسپی کا موجب ہوں گے

لباس۔ یوں تو حیدرآباد میں مختلف ممالک کے لوگ آباد ہونے کے باعث یہاں ہندوستان کے ہر حصہ ملک کے لباس کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً پنجابی۔ مدراسی۔ گجراتی۔ بنگالی وغیرہ۔ مگر حیدرآباد کا خاص لباس بھی دو قسم رکھتا ہے ایک تو وہ قدیم لباس جو تقریباً ڈیڑھ دو صدی سے یہاں مروج ہے۔ اور دوسرا وہ لباس جو اب عام طور سے مروج اور مرغوب اور مقبول ہو چلا ہے۔ جس کی ابتدا گزشتہ ربع صدی سے ہوئی۔ اور ہندو مسلمانوں میں رائج ہے۔

قدیم لباس کے اجزا۔ پاجامہ۔ کرتی۔ چولی اور دوپٹہ ہیں۔ پائجامہ نہ بالکل تنگ ہوتا ہے اور نہ بالکل ڈھیلا۔ نہ بدن سے بالکل پیوست ہوتا ہے اور نہ گھیردار یہ مختلف کپڑوں سے بنایا جاتا ہے۔ کمخواب۔ مشروع اور ہمرو وغیرہ قیمتی کپڑے کے علاوہ سوتی

کپڑے سے بھی بنایا جاتا ہے۔ مگر اہل پنجاب وغیرہ کی طرح کبھی سفید نہیں ہوتا۔ اس کا رنگین ہونا لازمی ہے۔

کرتی اور چولی۔ ململ اور جالی وغیرہ کپڑوں کے علاوہ ریشمی اور زریں بنارسی کپڑے کی بھی ہوتی ہیں۔ کرتی کو بلا آستین کی قمیص تصور کرنا چاہیئے۔ مگر قمیص کے برخلاف اس کے سینہ کا حصہ کسی قدر کھلا ہوا ہوتا ہے۔ اس پر مصالحہ وغیرہ بھی لگایا جاتا ہے اور قیمتی سے قیمتی ایک ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ اس میں صرف ہوسکتے ہیں۔

دوپٹہ کا طول عموماً ۴ گز کا ہوتا ہے یہ بھی ململ وغیرہ سوتی کپڑے کے علاوہ ریشمی اور زریں بھی ہوتا ہے۔ اس کو بھی قیمتی مصالحہ سے گراں قدر بناتے ہیں۔ یہ لباس اگرچہ قدیم ہوگیا ہے۔ مگر اب بھی بعض گھرانوں میں اس کا استعمال باقی ہے۔ علاوہ ازیں اکثر جگہ عام طور سے کنواری لڑکیوں کے لئے پائجامہ اور دوپٹہ ہی زیادہ مروج ہے۔ مگر بجائے کرتی کے قمیص یا کرتہ ہوا کرتا ہے۔

لباس کی دوسری قسم ساڑی کی ہے۔ اس کے ساتھ قمیص۔ کرتہ۔ جمپر بلوز سب کچھ استعمال کرتے ہیں۔ چولی۔ پیٹی کوٹ۔ اور چڈی اس لباس کے دوسرے اجزا ہیں ساڑیوں کے لئے مختلف سوتی۔ اور ریشمی زریں پارچے کارآمد ہوتے ہیں۔ اس پر مختلف اقسام کے کورلیس وغیرہ لگائی جاتی ہے۔ سوتی ساڑیاں جو ململ کی ہوتی ہیں۔ اس کو اکثر بلا کوریالیس کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ساڑی رنگین ہوتی ہے البتہ بیوہ عورتیں سفید ساڑی کا استعمال کرتی ہیں۔ مگر شوخ رنگ مرغوب نہیں ہے بلکہ ہلکا رنگ پسند کیا جاتا ہے۔ ریشمی پارچے باریک سے باریک اور موٹے دونوں مستعمل ہیں۔ موسم کے لحاظ سے اس کا رواج ہوتا ہے۔ ساڑی کا طول ساڑھے پانچ گز سے سات گز تک ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ جالی کی ساڑی بھی استعمال کی جاتی ہے اور اس پر چمکیاں لگائی جاتی ہیں۔ بنارسی زریں ساڑیوں کا بھی رواج

ہے۔ اس طرح دو ڈھائی روپیہ کی ساڑی سے لے کر چار، پانچ ہزار کی قیمتی ساڑی ہوتی ہے۔ غربا میں ولیسی سوتی ساڑیوں کا بھی رواج ہے جو نیچ قوم میں مروج ہے۔

قمیص کرتا، بلوس، جمپر وغیرہ اکثر اسی کپڑے کے بنائے جاتے ہیں جس کپڑے کی ساڑی ہوتی ہے اس طرح وہ ہم رنگ ہوتے ہیں مسلم خواتین میں بلا آستین کے بلوس اور جمپر کا بھی رواج ہو چلا ہے اور مرغوب ہو رہا ہے۔ ہم رنگ پاتا بہ اور کبھی ہم رنگ شو بھی ہوتے ہیں چپل کا بھی رواج ہے۔ اور زریں دہلی کے جوتوں کا بھی رواج ہے۔ پیٹی کوٹ عموماً سفید رنگ ہوتا ہے اور اکثر اس کے نیچے لیس وغیرہ لگائی جاتی ہے اس کے اندر چڈی بھی ہوتی ہے۔

زیور حیدرآباد میں مختلف زیور چاندی سونے اور جڑاؤ کا استعمال ہے ہاتھ پیر وغیرہ کے مختلف اقسام اور ان کے مختلف نام ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سر کے زیور۔ جھوم۔ چاند چمپا پھول۔ مرزا بے پروا۔ چوٹی کی تعویذ۔ ٹیکہ۔

کان و ناک کے زیور۔ انٹیاں۔ بھٹے۔ جھلملی۔ جھمکہ۔ چاند بالیاں چکرایاں چور پھول کرن پھول۔ لونگ کے پھول۔ وال۔

گلے کے زیور۔ چمپا کلی۔ چندن ہار۔ ستلڑا۔ لچھا۔ الا ہینسلی۔ ہار۔

ہاتھ کے زیور۔ بازو بند۔ تعویذ۔ بازو کے کڑے۔ کنگنی۔ ٹڑی۔ پہنچی۔ سمرن۔ کنگن۔ گوٹ چوڑ۔ آرسی۔ انگوٹھی۔ چھلہ

پاؤں کے زیور۔ پازیب۔ توڑا۔ رم جھول۔ گھول

مگر اب زیور کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور بعض مخصوص ولائتی زیور پر محدود ہو گیا ہے جو نکلس۔ چوڑ۔ دست بند۔ ایرنگ اور انگشتری پر منحصر ہے۔

قدیم زمانہ میں چوڑی کے جوڑے (جو ہاتھوں میں پہنے جاتے تھے) کا بڑا رواج تھا جو مختلف ناموں سے موسوم ہوئے۔ اور ۱۰۰ دو سو روپے قیمت تک کے ہوتے تھے۔

مگر اب ولائتی بلور کے چوڑ کا استعمال ہے۔ البتہ شادی بیاہ کے موقع پر چوڑی کے جوڑے کا رواج ہے۔ اور تین چار روپے سے لے کر بیس پچیس کبھی اس سے زیادہ کے بھی بنائے جاتے ہیں۔

مکان کی آراستگی۔ مکانوں میں چٹائی۔ شطرنجی۔ دری۔ چاندنی۔ سوزنی قالین۔ سند کا فرش ہوا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ولائتی کرسیوں، صوفوں وغیرہ کا بھی رواج ہے۔ اکثر مکانوں میں دونوں قسم کا فرش فرنیچر ہوتا ہے۔ غربا بھی چٹائی اور شطرنجی۔ یا کم از کم چٹائی کا فرش ضرور کرتے ہیں۔ تنہا و برا و شیشہ آلات وغیرہ سے بھی مکانوں کو زینت دی جاتی ہے۔ کمروں کے ہم رنگ پردے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

کھانے کے اوقات وغیرہ۔ حیدرآباد میں کھانے کے مختلف اوقات ہیں۔ صبح کا ناشتہ جو ۶ بجے سے صبح کے دس بجے تک ہوا کرتا ہے چائے کا استعمال اگرچہ عام طور سے ہونے لگا ہے۔ پھر بھی بعض خاندانوں میں اس کا رواج نہیں ہے دوپہر کا کھانا گیارہ بجے سے دو تین بجے تک ہوا کرتا ہے۔ سہ پہر کا ناشتہ تین بجے سے پانچ بجے تک ہوا کرتا ہے اور رات کا کھانا شام کے چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ہوا کرتا ہے۔

حیدرآباد میں چاول کا استعمال زیادہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ گیہوں کی روٹی بھی استعمال کی جاتی ہے۔

سالن کے مختلف اقسام ہیں جن کی صراحت طوالت کی موجب ہے۔ اسی طرح مٹھائیوں کے بیسیوں اقسام ہیں۔ اب یہاں ولائتی اور دیگر ممالک کے کھانے بھی پکائے جاتے اور پسند کئے جاتے ہیں۔

پردہ کے متعلق عام خیالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ ادنیٰ طبقہ میں قدیم سے

پردہ نہیں ہے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ میں بھی اب بے پردگی کا خیال ہوتا چلا ہے اور روز بروز پردہ دُور ہوتا جا رہا ہے۔ مگر پھر بھی پردہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فی صدی دس پانچ پردہ نہیں کرتی ہیں۔ مگر جن گھرانوں میں پردہ ہے وہاں بھی ملازمین وغیرہ سے پردہ نہیں ہوتا۔ اس طرح جو بہت زیادہ پردہ کی پابند ہیں ان کی تعداد فی صد پچاس قرار دی جا سکتی ہے۔ مگر نئی نسل جو اب مدارس میں زیر تعلیم ہے۔ جب وہ اسٹیج پر آجائیں گی یعنی ماں بن جائیں گی اُس وقت غالباً پردہ بالکل اُٹھ جائے گا۔

مضمون ہذا میں صرف مسلمانوں کی معاشرت پیش کی گئی ہے۔ اہل ہنود کی معاشرت کی صراحت کا موقع نہیں ملا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے ناظرات کو حیدرآباد کی معاشرت کا ایک خاکہ ذہن نشین ہوگا۔ فقط

خواتین ہند اور موسیقی

قدیم بدھی اور برہمنی زمانہ کے قطع نظر خود اسلامی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان موسیقی کے لیے مشہور تھا۔ شمالی ہند میں اکبر اور جنوبی ہند میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کا عہد حکومت خاص طور سے موسیقی کی سرپرستی کے لیے مشہور ہے۔ جب یہاں عام طور سے موسیقی کا رواج تھا تو دور دور کے ماہران موسیقی اکبر آباد (آگرہ) اور بیجاپور میں جمع ہو گئے تھے۔ اکبر کے زمانہ کا مشہور ماہر موسیقی "تان سین" کا نام تاریخ ہند سے محو نہیں ہو سکتا۔

اس زمانہ میں موسیقی معیوب تصور نہیں کی جاتی تھی شرفا اس میں حصہ لیتے اور ایک فن کی حیثیت سے اس کو حاصل کر کے کمال پیدا کرتے تھے۔ عالم گیر کے زمانہ سے یہاں موسیقی کا زوال شروع ہوا۔ اور شرفاء اس میں حصہ لینے سے قطعاً باز آ گئے۔ اور رہتے ہوتے موسیقی صرف خاص پیشہ ور طبقہ سے متعلق ہو گئی۔ اور قوال بھانڈ۔ میراثنیاں۔ اور طوائفیں گویا اس کی مالک و مختار بن گئیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب شرفا اور معززین اور ان کی اولاد آداب مجلس اور حاضر جوابی وغیرہ کے لیے طوائفوں کے یہاں جاتے۔ اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے کیونکہ وہ نہایت ممتاز ہوتی تھیں۔ ان کی قابلیت۔ سلیقہ شعاری مسلمہ ہوتی تہذیب اور آداب مجلس وغیرہ سے وہ بخوبی واقف ہوتی تھیں۔ اسی زمرہ میں ماہ لقا بائی۔ المتخلص بہ "چندا" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جو اپنی علمی قابلیت۔ شاعری۔ سخن فہمی اور جود و سخا کے لحاظ سے مشہور

تھی۔ ۱۱۶۹ھ میں یہ تولد ہوئی۔ اور ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔
جاگیر ومنصب سے ممتاز تھی۔ دولت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کے محل کی حفاظت کے لیے پانچسو سپاہی ملازم تھے۔ ارسطوجاہ اور میر عالم جیسے لوگ جو حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے اور اپنی قابلیت اور تدبر کے لیے مشہور تھے اس کے محل میں جاتے اور موسیقی کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ میر عالم نے تو اس کی تعریف میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ اس کو شعر وسخن سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ لندن میں بھی ہے۔ تاریخ سے بھی اسے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے ایماء سے دکن کی ایک تاریخ دل افروز کے نام سے لکھی گئی ہے۔

پھر ایک زمانہ آیا جب کہ طوائفوں کی حالت میں ابتری ہونے لگی۔ اور ان کے اخلاق وعادات بگڑنے لگے۔ ان کی لیاقت وقابلیت نابود ہوگئی اور وہ بالکل بازاری عام عورتوں کی طرح رہ گئیں جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک جاسکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شرفا ومعززین نے ان کے جلسوں کی شرکت چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ موسیقی میں بھی زوال آگیا۔ اور شرفا اس سے ناواقف ہوگئے۔

یورپ میں موسیقی کی یہ حالت نہیں ہے وہاں اس کی خاصی ترقی ہو رہی ہے اور ماہرین موسیقی کی بڑی عزت ہوتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہماری خواتین طوائفوں کا گانا معیوب تصور کرتیں اور طوائف کو شرفا کے مکانوں کے زنانے میں رسائی نہ ہوتی تھی وہ شریف خواتین کی مجلسوں اور محفلوں میں قدم نہ رکھ سکتی تھیں۔ مگر بہ تدریج اس میں تغیر ہوتا گیا اور اب خواتین بھی دوسرے گانوں سے ان کے مجرے کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ پردے کے باہر طوائفوں کے طبلے اور سارنگی ساز بیٹھا کرتے اور زنانہ مجلس میں پردہ کے اندر طوائفیں بیٹھ کر گاتی ہیں۔

اس کے ساتھ دوسرا تغیر یہ ہو رہا ہے کہ بعض شریف گھرانوں کی لڑکیاں پیانو اور ہارمونیم اور کہیں ستار پر بھی گانے میں مشق کرنے لگی ہیں اور بتدریج اس کا رواج ہو رہا ہے اور اس کی ترقی دن بدن زیادہ ہو رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری خواتین اور نوعمر لڑکیوں کا اس قسم کی موسیقی سے واقف ہونا مناسب ہے یا نہیں؟

اس کے متعلق جو امور مفید اور غیر مفید ہو سکتے ہیں۔ ان پر پہلے غور کرنا چاہئے سب سے پہلے تعلیم دینے والوں کے متعلق سوال ہو سکتا ہے کن لوگوں سے اس کی تعلیم ہو گی۔ مرد اور پیشہ ور عورتیں اس کی تعلیم دیا کریں گے یا مدرسہ میں اس کی تعلیم ہو اور وہاں بھی تعلیم دینے والے کون ہوں گے۔ پہلی تو کسی حیثیت سے مفید نہیں ہو سکتی۔ اس سے اخلاق پر بُرے اثرات کا اندیشہ ہے۔ اس لئے دوسری صورت یعنی مدرسہ میں اس کی تعلیم ہونی چاہئے۔ اور وہاں بھی جو عورتیں ان کی تعلیم کے لئے مقرر کی جائیں ان کا اخلاق نہایت بلند ہونا ضروری ہے۔

موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے سے ایک تو یہ ہو گا کہ ایک فن لطیف کی سرپرستی ہو گی۔ اور یہ فن پیشہ ور طبقہ سے منسوب ہو کر جو بدنام ہو گیا ہے اس کی اصلاح ہو جائیگی۔ دوسرے یہ کہ ہماری سوسائٹی کے مرد جو گانے کے شوق میں ادھر اُدھر پھرا کرتے ہیں اس سے بچ جائیں گے۔

اس لئے میرے خیال میں مدارس میں موسیقی کی تعلیم کا باقاعدہ اور اعلیٰ انتظام ہونا چاہئے۔ فقط

(رسالہ عصمت)

حیدرآباد کی مامائیں

حیدرآباد کی مامائیں بھی ایک دلچسپ عنوان ہے۔ اس عنوان پر کچھ لکھنا حسن کار کے ناظرین اور ناظرات کے لیے تفریح طبع کا سامان ہو سکتا ہے۔

ماماؤں کی موجودہ زمانہ میں جو حالت ہے۔ اس کی صراحت سے پہلے ہم ایک صدی پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ کی ماماؤں کی حالت آج سے بہت مختلف تھی۔ ان کی تنخواہ ان کے اختیارات ان کا لباس ان کی بود و باش کے طریقے سب ہی آج سے نرالے تھے۔ ان کی تنخواہ کے متعلق واضح ہو کہ جہاں ان کو سینکڑوں اور ہزاروں روپیہ کی جاگیریں عطا ہوتی تھیں وہاں اُن کی ماہوار ایک روپیہ دو روپیہ بھی ہوتی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں روپیہ کی گرانی اور محنت کی ارزانی تھی اس لیے یہ کمی ماہوار کوئی حقیر تنخواہ نہیں تھی بلکہ اس ماہوار میں وہ خوش و خرم اور فارغ البال رہا کرتی تھیں۔ اور چونکہ ضروریات کم اور اشیائے مایحتاج ارزاں تھے اور اکثر وہ دن رات اپنے آقا کے گھر میں ان کے بال بچوں میں رہا کرتی تھیں اور کھانا بھی ملا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ماہوار میں لباس اور زیور بھی تیار کرتی اور نقدی پس انداز کرتیں۔ ان کے بڑے بڑے اختیارات ہوتے تھے وہ خود کو ملازم تصور نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ مالک کے کنبہ کا ایک فرد خیال کرتیں اور اسی طرح رہتی تھیں۔ اور گھر کے لوگ بھی ان کو اسی طرح تصور کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یہ مامائیں مرتے وقت اپنے پس انداز اور اثاثہ وغیرہ کو آقا کی اولاد کے سپرد کر دیتی تھیں۔ ان کے حقیقی ورثاء کو اس میں دخل نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح جاگیردار ماماؤں کے بڑے بڑے اختیارات ہوتے تھے کسی کے ذمہ خانگی خرید و فروخت

کا پورا کام متعلق ہوتا تھا۔ وہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روپیہ کا سامان جواہر ملبوسات وغیرہ خرید کرتیں اور ان کا حساب کتاب رکھتی تھیں کسی کے ذمہ ارباب نشاط کا انتظام ہوتا تھا۔ کوئی دوسرے ملازمین کی نگرانی کرتی تھی کسی کے متعلق پکوان کا انتظام ہوتا تھا تو کسی کے ذمہ محلوں کی آراستگی ہوتی کسی کے ذمہ عرض و معروض کی خدمت متعلق تھی۔ غرض یہ بڑے بڑے کام انجام دیتی تھیں۔ بلکہ بعض مرتبہ انھوں نے ایسے ایسے کام انجام دیئے ہیں جو کسی سلطنت کے وزیر سے انجام نہ پائے ہوا کرتے۔

ان بڑی بڑی صاحب اقتدار ماماؤں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ ماما جمیلہ۔ ماما رمضانی۔ ماما شریفہ۔ ماما دلارام۔ ماما بڑن۔ ماما بدھن۔ ماما خنو۔ ماما چمپا ماما حمیدہ۔ ماما چاند وغیرہ۔ ماما جمیلہ کی ڈیوڑھی تو آج تک موجود و مشہور ہے مرحوم اعلیٰ حضرت کی مسند نشینی چونکہ صغیر سنی میں ہوئی تھی اس لئے دربار میں آپ ماما جمیلہ کی گود میں تشریف فرما تھے۔

ان قدیم ماماؤں کا لباس بھی مخصوص تھا۔ وہ ہمرو۔ مشروع یا سوسی کا پاجامہ پہنا کرتی تھیں۔ سفید ململ کی چولی اور کرتی ہوتی۔ باریک ململ کا چنا ہوا دوپٹہ۔ اوڑھتی تھیں۔ ان کے زیور بھی مخصوص تھے۔ عموماً ڈنڈ کے کڑے کنگنیاں اور چولی کے موتی (بھی) ضرور ہوتے تھے۔ قدیم طرز کا جوتہ پہنا کرتیں۔ جو آج بھی کبھی حیدرآباد کی دلہنوں کو پہنایا جاتا ہے

بڑی بڑی مامائیں تو رتھ میں سوار ہوتی تھیں اور دوسری عام مامائیں برقعہ اوڑھ کر نکلا کرتی تھیں۔ اکثر مامائیں تو رات دن آقا کے مکان میں رہا کرتیں ان کے واسطے علیحدہ کمرہ ہوتا تھا۔ اگر صاحب خانہ مالدار نہ ہو اور مکان چھوٹا ہو تو وہ دالان میں سویا کرتیں۔ آٹھویں یا دسویں دن اپنے مکان کو جاتیں اور

وہاں ایک روز رہ کر آتی تھیں۔

ایک عرصہ تک ان کی ماہوار اور لباس وغیرہ میں فرق نہیں ہوا۔ مگر بتدریج تنخواہ میں اضافہ ہونے لگا۔ اور اسی طرح لباس میں بھی تبدیلی ہوتی گئی آج سے بیس سال قبل ماماؤں کی تنخواہ کا اسکیل زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ تین چار روپیہ ماہوار لیا کرتیں اور دن رات رہتی تھیں۔ تنخواہ کے سوا ناشتہ اور دونوں وقت کھانا ملا کرتا البتہ بڑے بڑے امرا کے پاس ان کی ماہوار زیادہ ہوتی تھی۔ مگر وہ پہلی صورت جو سینکڑوں ہزاروں روپیہ کی جاگیریں ملنے کی تھی وہ موقوف ہو چکی تھی۔ ان کے لباس میں فرق آنے لگا تھا ململ کے دوپٹہ کے ساتھ ہمکنڈہ کے رومال کے دوپٹے اور ململ کی ساڑی بھی استعمال ہونے لگی تھی۔ مگر قدیم لباس کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی اس زمانہ کی ایک تصویر جو ان ماماؤں کے لباس اور زیور وغیرہ کو بخوبی ظاہر کرتی ہے "گلمز آف دی نظام ڈومینینس" میں شامل ہے۔ یہ تصویر حسن بن عبداللہ المخاطب نواب عماد نواز جنگ کے یہاں کے ماماؤں کی ہے غرض کہ گزشتہ ماماؤں کی کوئی بات آجکل باقی نہیں ہے اب اس کی حیثیت ایک افسانہ کی ہے۔ چند دن کے بعد یہ بھی فراموش ہو جائے گا۔ آجکل تو ماماؤں کی سخت قلت اور کال ہے۔ دفتر کے لئے اہلکاروں کا ملنا سہل ہے عقد کے لئے بی بی کا دستیاب ہونا آسان ہے گانے کے لئے طوائف کا ملنا دشوار نہیں ہے۔ لیکن ماما کا ملازمت کے لئے دستیاب ہونا مشکل تر اور دشوار تر ہے۔ اور پھر ان کی تنخواہ کا اسکیل زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اب ان کی تنخواہ دس بارہ بلکہ پندرہ روپیہ تک پہنچ چکی ہے۔ مگر پھر بھی خوش نہیں۔ کھانا پہلے کی طرح اب بھی ملتا ہے، مگر اب سہ پہر کی چائے بھی طلب ہونے لگی ہے۔

لباس میں بھی پوری تبدیلی ہو چکی ہے۔ پائجامہ اور دوپٹے نام کو نظر نہیں آتے۔ اس کی جگہ پوری طرح ساڑی نے لے لی ہے۔ اس میں بھی کچھ فرق ہے کچھ تو

ململ کی رنگین ساڑیوں کا استعمال کرتی ہیں اور کچھ گاؤں کی موٹی سوتی ساڑیاں پہنا کرتی ہیں کرتی کے ساتھ قمیص یا پیشاید بلوس کا رواج ہے۔ زیور اب بہت کم نظر آتے ہیں جو کوئی نہیں پہنتا۔ برقعہ کی جگہ صرف چادر باقی ہے۔ بلکہ یہ بھی کم ہو چلی ہے۔ اب ان کے اختیارات اور ان کی بود و باش کے طریقے بالکل بدل چکے ہیں۔ اکثر وہ رات دن نہیں رہتیں دوپہر اور شام کو چلی جاتی ہیں۔ کھانا ملازمت کی جگہ نہیں کھائیں گی بلکہ اپنے مکان کو لے جاتی ہیں۔ البتہ بعض مامائیں تمام دن رہ کر شام کو اپنے مکان چلی جاتی ہیں۔ غالباً ایسی بہت کم ہوں گی جو رات دن رہا کرتی ہیں۔ اِلّا خاص اسباب کے تحت جن کی صراحت آگے آئی ہے۔ تعلیم یافتہ بی بی کے آگے اب ماماؤں کی زیادہ نہیں چلتی مگر گھر کی بیوی کی حیثیت ناخواندہ بی بی ہو یا اگر "ماماجی" صاحب خانہ کی منھ چڑھی ہو تو پھر اس کی خوب بنجھتی ہے۔ اور "متوطن مسافروں" کی یہاں بود و باش سے جہاں ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا ہے اور دستیابی دشوار ہو گئی ہے وہاں ان کے اختیارات بھی نامحدود اور خدمات میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ کی تنخواہ اور ان کے لباس وغیرہ کی صراحت تو ہو چکی ہے مگر ان کے کردار کے لحاظ سے ان کی خاص تقسیم ہو سکتی ہے جس کا بیان ضروری ہے۔ ماماؤں کی تقسیم حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک ماما تو وہ ہے جو مولانا نذیر احمد کی "ماما عظمت" کے کردار رکھتی ہے بنا کر چُراتی اور جتا کر لیتی ہے۔

(۲) دوسری ماما وہ ہے جو ماما "دیانت" کے کردار والی ہے۔ آقا کی خیر خواہ اس کے مال و زر کی خبر گیر بچا کر سامان خرید کرتی اور جانچ کر مال لیتی ہے۔

(۳) ماما کی تیسری قسم وہ ہے۔ جو بیوی کی جاسوس ہوتی ہے۔ بی بی کے

حکم کی تعمیل میں وہ میاں کی جاسوسی کرتی ہے۔ چپراسیوں اور شوفر سے میاں کے ملنے والوں اور میاں کے جانے کے مقامات کی اطلاع وقت بوقت بی بی کو دیا کرتی ہے۔ یہ ماما بی بی کی مصاحبہ ہوتی ہے۔ میاں کو معلوم ہے کہ ماما ان پر جاسوس ہے۔ مگر مجال نہیں کہ اس کو علیحدہ کرا سکیں یا حرفِ شکایت زبان پر لا سکیں

(۴) چوتھی قسم تیسری قسم کی عکس ہے اس نوع کی وجہ سے اکثر گھر میدانِ جنگ رہتے ہیں۔

(۵) پانچویں قسم کی ماما وہ ہے جو گھر کے دوسرے مرد ملازمین کے ساتھ رشتۂ اتحاد مستحکم کر کے اس وقت تک رہنا چاہتی ہے۔ جب تک کہ ان کے دوست ملازم صاحب شوفری یا خدمتگاری کے فرائض انجام دیتے رہیں۔ ایسی ماماؤں کا بڑا وقت گھر کے کام کے بجائے باہر اوٹ ہوسنرس میں گزرتا ہے۔

(۶) چھٹی قسم وہ ہے جو نیو فیشن ماما کہی جاسکتی ہے یہ ٹیڑھی مانگ نکالتی ہے اور سگرٹ پیتی ہے اور بی بی کی جگہ قابض ہو جاتی ہے اور دوسرے ملازمین پر حکومت بھی کرتی ہے

(۷) ساتویں قسم کی ماما وہ ہے جس کو بدصورتی میں امتیاز ہوتا ہے یا کبر سنی کے باعث خاص طور پر ملازم رکھی جاتی ہے تاکہ عظیم بیگ چغتائی صاحب والی اندھیرے کی "نازو کی" قائم مقامی نہ کر سکے۔

(۸) آٹھویں قسم کی ماما وہ ہے جو ملازمت کے ساتھ ملازمت کے گھر میں اپنی جوانی کی تشنگی کی جویاں رہتی ہے اور عدم کامیابی پر ملازمت وبالِ جان ہو جاتی ہے اور ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لیتی ہے۔

(۹) نویں قسم کی ماما وہ ہے جو اپنے کام کاج اور حسنِ عمل سے میاں بی بی اور بچوں بلکہ گھر بار کو خوش رکھتی ہے۔

(رسالہ حسن کار)

میاں بیوی کی نااتفاقی کی ایک بڑی وجہ

میاں بیوی کی نااتفاقی ایک عام مرض ہے جو ہماری معاشرت کا جزو لاینفک ہوگیا ہے۔ گویہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ بھی اس سے پاک نہیں ہے۔ مگر وہاں کے وجوہ دوسرے ہیں۔ اور ہماری وجوہ جداگانہ۔ ہمارے یہاں جس طریقہ سے بیوی کا انتخاب ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے برخلاف اختلاف نہ ہونا تعجب انگیز ہوتا۔

یورپ میں نااتفاقی اور طلاق کی ایک بڑی وجہ جہاں تک میں نے دریافت کی تھی وہ یہ تھی کہ جب کسی مالدار مرد یا عورت سے ملاقات ہو جاتی ہے اور اس کے حصول مال کا امکان ہوتا ہے تو پھر آپس میں نااتفاقی ظاہر کرکے علیحدگی حاصل کرلی جاتی ہے۔ تاکہ اس دوسرے کے مال سے فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ ہمارے یہاں نااتفاقی اور مخالفت کے کئی اسباب ہیں مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ جس کی وجہ سے نااتفاقی ہوتی ہے طبیعتوں کا اختلاف ہے۔

شوہر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی سلیقہ مند ہو کفایت شعار ہو۔ صفائی و پاکیزگی کی دلدادہ ہو۔ ہنس مکھ ہو۔ شیریں گفتار ہو تربیت اولاد کا سلیقہ ہو۔ جامہ زیبی کا ملکہ ہو۔ غرض کہ ہنرمند اور باسلیقہ عورت ہو بیوی کی طبیعت اس سے جدا ہے۔ تو پھر وہ گھر دوزخ ہو جاتا ہے وہ باہر سے محنت کرکے تھکا ہوا گھر آتا ہے۔ امید یہ کرتا ہے کہ مکان میں جانے سے راحت نصیب ہوگی اور آرام ملے گا۔ مگر جب گھر میں آتا ہے تو اس کو آرام اور چین نہیں ملتا۔ گھر کو دیکھتا ہے نہ تو وہ آراستہ ہے اور

نہ پاک ۔صاف ۔ سامان ہے کہ بے ترتیب ہر طرف کوڑہ کرکٹ نہ صفائی نہ نہ آراستگی ۔کوئی شے قرینے سے نہیں ۔گھر کے ساتھ ساتھ گھر والی میلے کچیلے کپڑے پہنے منہ پھلائے اس کے نہ تو کپڑے پاک وصاف ہیں اور نہ بدن ملازموں اور بچوں پر خفگی ہو رہی ہے ۔وہ خرچ کے طریقے سے واقف نہیں ۔کفایت شعاری نہیں جانتی ۔ملازمین پر دار و مدار ہے ۔اس وجہ سے اخراجات زیادہ ہوتے اور پھر کھانا بھی اچھا نہیں ملتا ۔میاں کی خواہش ہے کہ بیوی ہر وقت ہنس مکھ رہے اس کے درد و غم کو اپنی گفتگو اور ہمدردی سے دور کرے ۔مگر جب میاں گھر آتا ہے تو اس کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی اس کو مکان میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی راحت اور آرام کے لئے دوسری جگہ دوسرے گھر کا متمنی ہوتا ہے ۔بچوں کی تربیت سے وہ واقف نہیں ۔ نہ تو ان کی صحت کا خیال رہتا ہے اور نہ ان کے درستگی اخلاق کا بچوں کی یہ حالت دیکھ کر میاں کا اظہار ناراضی کرنا غلط نہیں ۔اب پھر وہی لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی ہے اگر کسی مرد کو ایسی عورت مل جائے جس کی طبیعت مرد سے جدا گانہ ہے ۔ تو پھر کوئی صورت اتفاق کی نہیں ہے ۔البتہ ایک صورت سے امن نصیب ہو سکتا ہے ۔یعنی وہ اندھا بہرا گونگا بن جائے تاکہ اس کو نہ تو کچھ نظر آئے اور نہ کچھ سنے اور نہ کچھ کہے ۔ایسی صورت میں آئے دن کی لڑائی جھگڑے سے امن مل سکتا ہے ۔

(رسالہ عصمت)

جوتے کی کہانی اسی کی زبانی

او ولائتی چمڑے کے میرے دیسی بھائیوں تم کو میں اپنی سرگذشت۔ اپنی کہانی اپنی داستان سُناتا ہوں۔ نہیں معلوم دوسروں کے لئے کچھ دلچسپی کا سامان ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر کچھ ہو میں اپنے صحیح حالات گوش گزار کرتا ہوں

مجھے یاد نہیں ہیں کس ملک کے گائے بیل کی کھال ہوں نہیں معلوم کس جنگل کی گھانس میرے جاندار نے کھائی۔ اور کس تالاب کا پانی پیا۔ البتہ یہ مجھے معلوم ہے میں ہندوستان میں پیدا ہوا۔ برہنہ بدن چرواہے نے چرایا جو سوکھی روٹی اور غیر صاف شدہ پانی پر بسر کرتا تھا اور اپنے جانوروں کی نہایت خوبی سے حفاظت کرتا۔ کبھی تالاب پر ہم کو نہلاتا کبھی بارش سے ہم خود ہی غسل کر لیتے تھے۔ کبھی ہم کو سبز ترو تازہ گھانس میسر ہوتی اور کبھی چٹیل میدان میں ہماری بسر ہوتی۔

ایک مدت کے بعد میرے جاندار کو ذبح کیا گیا نہیں معلوم مسلمانوں کی عید میں ذبح ہو کر ناحق کشت و خون ہوا یا صاحب لوگوں کی خوراک کے لئے کاٹا گیا۔ میرے لئے دونوں صورتیں مساوی تھیں۔ مگر جو لوگ پہلی صورت میں میرے لئے لڑنے مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے دوسری صورت میں خود ہی میری فروخت کے بانی ہوتے تھے۔ میں اس طرفہ تماشا پر آج تک حیران ہوں

ہاں تو مجھ کو ایک مدت کی ہم جنسی کے بعد گوشت سے جدا کیا گیا۔ اگرچہ میں پہلے بھی چمڑا تھا مگر گوشت کی ہم جنسی کے باعث میرا نام گائے بیل تھا۔ اب

صرف علیحدگی کے بعد مجھے دوسرا نام دے کر کھال سے موسوم کیا گیا۔ اب اگر کوئی میرے پہلے نام سے یاد کرے تو بے وقوف کہلائے اور دنیا اس پر قہقہہ لگائے۔ دیکھو صرف جنس کی علیحدگی سے کتنا تغیر ہو گیا۔

اب اس علیحدگی کے بعد مجھے کئی دن پانی میں رکھا گیا۔ اور کئی طریقہ سے غسل دیا گیا۔ بڑی محنت کے بعد تھوڑی سی قیمت پر گوری قوم کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ اور میں ریل اور پھر جہاز کا سفر کرکے ایسے ملک میں پہنچا۔ جہاں سردی کے زمانہ میں کئی کئی دن آفتاب کی صورت نظر نہیں آتی۔ اور دن کے تین بجے غروب ہو جاتا ہے۔ اور گرمیوں کے زمانہ میں رات کے نو دس بجے تک غروب نہیں ہوتا۔ یہاں مجھے لوہے کی کلوں میں گردش دی گئی۔ میری صورت تبدیل ہو گئی۔ مجھے رنگ اور روغن دے کر کچھ سے کچھ کر دیا گیا۔ بلکہ یوں خیال کرو میں انڈیا کے کالے آدمی کے بجائے یورپ کا مہذب بن گیا۔

اب پھر جہاز اور ریل کے ذریعہ ہندوستان کو واپس کیا گیا۔ اور بے وقوف وطن والوں نے مجھے بڑی گراں قیمت میں واپس لیا۔ وہ اس کو بھول گئے ہیں ان کے پاس سے ہی ایک قلیل رقم میں خریدا گیا تھا۔ مگر ظاہری شو اور رنگ و روغن نے میری قیمت کیا سے کیا کر دی۔ اس طرح دونوں مرتبہ وطن والوں نے نقصان اٹھایا۔

خیر تو اب پھر میرے حصے کیے گئے۔ اور سوت کی شرکت سے میری وضع بالکل بدل گئی۔ اور میرا پہلا نام باقی نہیں رہا۔ بلکہ "بوٹ" کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اور کاپنور سے بند ہو کر حیدرآباد پہنچا۔ ریل کے سفر کسٹم سے رہائی کے بعد "جیب کمپنی" نام میں قیام کیا۔ ہاشمی نام والے صاحب نے مجھے اتنی قیمت میں خریدا جتنی قیمت کو میری اصلی پوری کھال فروخت ہوئی ہوگی

حالانکہ اب میں اس کا بیسواں حصّہ بھی نہیں تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا حیثیت بدل جانے سے قیمت میں کس طرح اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ظاہری تبدیلی قیمت کے ساتھ نام کو بھی بدل دیتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی رنگ آمیزی۔!!!

ایک مدت تک میں ہاشمی صاحب کے زیر استعمال رہا اور کبھی پیدل کبھی سائیکل پر سوار ہو کر شہر حیدر آباد میں گشت کرتا رہا۔ یہاں کے دفاتر دیکھے۔ یہاں کے باغات کی سیر کی۔ یہ میرے خواب اور خیال میں بھی نہ تھا پھر مجھے ریل اور جہاز کے ذریعہ مغربی ممالک کی سیر کرنی ہوگی نہ تو مجھے یورپ کی واپسی کے بعد اور نہ بوٹ کہلانے کے بعد اور نہ ہاشمی صاحب پاس منتقل ہونے پر اس امر کا خیال ہوا تھا۔

ہاں تو بھائیو پھر اب میں نے دوسری مرتبہ یورپ کا سفر کیا مگر میرے سابق اور اب کے سفر میں بڑا فرق ہے۔ پہلے طوق و سلاسل میں جکڑ کر قیدی کی طرح وہ بھی قید تنہائی میں ایک سست رفتار جہاز میں سفر کیا تھا اور اب بلا قید و بند تیز رفتار جہاز پر روانہ ہوا۔ مجھے پھر اندازہ ہوا حالت کے بدل جانے سے کس قدر فرق ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں میں نے بمبئی کے سوا عدن۔ پورٹ سعید۔ نیپلز۔ جنیوا۔ پیرس دورسے ہوتے ہوئے لندن کا سفر کیا۔ مگر ہنوز میرا سفر ختم نہیں ہوا مگر اس سے پہلے مجھے اور حالات بیان کرنے ہیں۔

اس سفر اور یورپ کے قیام میں مجھے کئی امور کا تجربہ ہوا۔ کئی ممالک کو دیکھے۔ کئی اقوام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہم جنس کہیں تو مجھ سے ہم کلام ہوئے۔ کہیں خاموشی اختیار کی۔ جنوبی ہند کی طرح یہاں ایک شخص بھی ایسا نظر نہ آیا جو میری جنس کو استعمال نہ کرتا ہو۔ غریب سے غریب بھی میری

جنس کو ساتھ رکھتا تھا۔ سوتے کے سوائے کبھی جدا نہ کرتے تھے۔ اس سفر میں میں نے اپنی جنس کے مختلف قسم اور رنگ دیکھے۔ میری کسی جنس کو موٹے تازے انسانوں نے استعمال کیا تھا تو وہی میری جنس کو کسی حسینہ نے بھی استعمال کیا تھا۔ اور پھر میرے مختلف صورتیں تھیں۔ میری کوئی جنس تفریح کے اوقات میں مخصوص تھی تو کوئی کھیل کود کے لئے کوئی بارش کے لیے تو کوئی ڈانس کے لئے غرض کہ میری ہزار صورتیں تھیں۔

اس سفر میں مجھے ایک اور بات معلوم ہوئی۔ رات کے وقت جب میں ہاشمی صاحب کے پیر سے جدا ہو جاتا تھا تو حجرہ کے اندر مقفل رہنے کے بجائے مجھے آزادی دے کر کمرے سے باہر کر دیا جاتا تھا۔ یہاں میں صبح صادق تک قیام کرتا۔ مگر طلوع آفتاب سے پہلے گوری قوم کے آدمی جو ہندوستان میں صاحب بہادر کے لقب سے مخاطب ہونے میں آتے اور مجھے صاف کر کے پالش لگا کر چلا دیا کرتے تھے تاکہ دوسرے دن صبح سے شام تک اپنے مالک کی خدمت سرخ روئی سے کر سکوں

ہاں بھائیو اب میں کچھ اور حال بیان کرتا ہوں۔ میں ایک عرصہ دراز کے استعمال کے باعث کسی قدر کہنہ ہو گیا تھا مگر کہیں سے چاک نہیں ہوا تھا البتہ میرے نیچے کا حصہ ضرور گھس گیا تھا۔ ہاشمی صاحب دیگر جوتوں کے ساتھ مجھے بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ کہ میری ایڑی اور "تلا" اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے میں ہاشمی صاحب کے کمرہ سے غائب ہو گیا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا ان کو میرے غائب ہوتے پر بڑا تعجب ہوا تھا۔ اور میرے غائب ہونے پر اپنے دونوں کمرں کا خوب جائزہ لیا تھا۔ مگر میں نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اور میں ملتا کیونکر جب کہ کمرہ میں میرا وجود ہی نہیں تھا۔

دوستو تم کو بڑا تعجب ہوگا آخر میں کہا چلا گیا؟ سنو دوستو تم کو میری

قسمت پر بڑا حسد ہوگا۔ میری ترقی پر رشک سے جلو گے۔ اور اپنی بدنصیبی پر کف افسوس ملو گے۔ دوستو میں اس وقت بھی اس مسرت۔ سرور اور انبساط سے سرور حاصل کر رہا ہوں اور اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوں لے میرے ہم جنسو تم کو بڑا اشتیاق ہوگا اور تعجب کرو گے آخر وہ کیا خوش نصیبی تھی جس پر میں نازاں ہوں اور پھولا نہیں سماتا۔

ایک دن جب کہ ہاشمی صاحب میرے دوسرے ہم جنس کو ساتھ لے کر مکان سے جا چکے تھے اور میں کمرہ میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آرام لے رہا تھا۔ ایک نوجوان حسین لڑکی آئی جو بہت خوبصورت تھی۔ اس کا جسم سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کے اعضا متناسب اور موزوں تھے۔ غرضکہ وہ خوبصورتی میں اپنے آپ نظیر تھی وہ آئی اور مجھے اپنے گود میں اُٹھالیا۔ اور کاغذ کی موٹر میں سوار کر کے لے چلی۔ میں بازار گیا اور وہاں مجھے اپنی جنس کے دواخانہ میں رجوع کیا گیا۔ یہاں بھی اسی رنگ اسی قسم کی لڑکیوں نے مجھ پر عمل جراحی کیا۔ میرے جسم پر نئے اجسام پیوست کیئے گئے۔ اور بالکل نیا بنا دیا گیا۔ اگر تم مجھے اُس وقت دیکھتے تو ضرور رشک کرتے کہ میں ابھی بازار سے نیا آیا۔ اور ہنوز استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے تم اس کو غلط تصور کرو۔ مگر یہ بالکل صحیح ہے۔ میری حالت بالکل نئی جیسی ہوگئی تھی۔

ہاں تو میں اپنے عمل جراحی کے بعد واپس ہوا کس طرح؟ اسی طرح جس طرح مکان سے روانہ ہوا تھا۔ یعنی اسی لڑکی کی گود میں مجھے ہاشمی صاحب کے کمرہ میں لایا گیا۔ اس وقت مسٹر موصوف کمرے میں موجود تھے۔ میرے حامل نے اُن کو مخاطب کر کے کہا، نصیر تمھارے لیئے بوٹ خرید لائی ہوں

ان کو اول تو کچھ تعجب ہوا۔ مگر پھر سمجھ گئے اور ہنس کر "تھنکیو" کہا۔ بھائیو یہ لفظ بھی عجیب ہے۔ میں اس کے سننے سے عاجز آگیا ہوں۔ جدھر دیکھو تھینکیو تھینکیو

اس کے بعد ہاشمی صاحب نے میری اُجرت دریافت کی مس صاحبہ نے کہا جلدی نہیں پھر دیدینا۔ پھر دریافت پر کہا پانچ شلنگ تقریباً سوا تین روپیہ جو شکریہ کے ساتھ ادا کیے گئے۔

دوستو اگر یہی کام ہندوستان میں ہوتا تو غریب موچی بارہ آنے طلب کرتا مگر شاید اس کو گراں تصور کیا جاتا۔ مگر نہیں یہ تو کسی قدر صحیح ہے میری ایسی عمدہ حالت ہو دنہ کرآتی ایک اور امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے وہ مجھ پر عمل جراحی کرنے کے لیے نہ تو ایسے آلات ہوتے اور نہ ایسا عمدہ چمڑا دیا جاتا۔ بہرحال کئی امور کا فرق ہے۔

ہاں ایک اور بات سنو جن لڑکیوں نے میرے متعلق موچی کا کام انجام دیا شاید ان کے کام کی حالت میں بعض ہندوستانی ان سے کلام کرنے کو ننگ و عار خیال کریں۔ مگر یہی کام کرنے والیاں کام کے ابھار و پھیر ششینہ اور کپڑے پہن کر جب عمدہ لباس میں ملبوس نظر آتی ہیں اس وقت ان کے موچی ہونے کا کچھ بھی تو شائبہ نہیں ہوتا۔ باغوں میں رستوں میں سینما میں رسٹورنٹ میں وہ خاص چال ڈھال سے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ کہ آپ کی نگاہ ان کی طرف اٹھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہی لوگ جو ننگ و عار خیال کرتے تھے اب ان سے ہم کلام ہونے یا ان کے ساتھ ڈنر کھانے کو فخر خیال کرتے ہیں۔

اب میں پھر اول کی طرح مستعدی سے اپنے کام کو انجام دینے لگا اس کے بعد مجھے انگلستان کے مختلف شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے انگلستان کے

مدینۃ العلوم آکسفرڈ اور کیمبرج کے کتب خانوں۔ تفریح گاہوں عجائب خانوں کی سیر کی۔ عجائب خانوں میں میں نے اپنے وطن کی اور بعض اپنے جنس کی چیزیں بھی دیکھیں۔ انگلستان سے گزر کر اسکاٹ لینڈ تک پہنچا یہاں کے شہر اڈنبرہ۔ گلاسگو۔ نیوکاسل دیکھے۔ اس کے بعد لندن سے ہوتے ہوئے فرانس کی سرزمین دیکھی۔ چند ماہ پیرس کی گلیوں کی خاک پیمائی کی۔ یہاں کے جلوے خصوصاً موسم گرما کے متحیر کن تھے۔

باغوں میں گل پوش چمنوں کی بہاریں نظارے۔ پھولوں میں بسی ہوئی مشکبار و عطر بیز ہوائیں لالہ زاروں کی گل کار جلوہ ریز فضائیں۔ قدرت کے دل آویز کرشمے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

خواتین یورپ کی جلوہ نمائی جو موسم گرما میں نظر آتی وہ میرے لئے بالکل متحیر کن تھی۔ خوبصورت اور رنگ برنگ کے پھول جہاں باغوں میں اپنے جلوؤں سے قدرت کی جلوہ نمائی کرتے تھے وہیں خواتین یورپ کے رنگ برنگ کے معطر لباس بھی کرشمہ سازی کر رہے تھے غرض یہ طویل داستان ہے۔ بالآخر ایسے مناظر کو چھوڑ کر ہندوستان کی طرف مراجعت کرنی پڑی اور حسرت سے میں نے کہا

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

(رسالہ عصمت)

حسین بی بی

اخبار "پیام" مورخہ ۱۹۔مہر اور رہبر دکن مورخہ ۲۷۔مہر میں مندرجہ بالا عنوان سے دو مضمون شائع ہوئے ہیں۔پہلا مضمون مس لیس احمد حسین کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ خوبصورت بی بی کی خواہش نہ کرنی چاہیے کیونکہ حسین بی بی عموماً بد مزاج ہوتی ہے۔اس لیے انتخاب کے وقت حسن صورت کے بجائے حسن سیرت کو ترجیح دینی چاہیے۔

دوسرا مضمون "ناہید" کا ہے اس نام سے بعض افسانے بھی شائع ہوئے ہیں مضمون کے اسلوب بیان سے اس امر کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ مضمون ایک بڑی افسانہ نگار اور شاعرہ کے قلم کا رہین منت ہے۔

"ناہید کا دعویٰ یہ ہے کہ حسن بڑی اچھی چیز ہے۔ہر شخص حسن کا خواہاں ہوتا ہے۔ اللہ جمیل یحب الجمال سے اس کی اہمیت واضح ہو سکتی ہے۔لہٰذا حُسن کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں اولاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسن کا معیار کیا قرار دیا جائے؟ کیا صرف گورا رنگ خوبصورتی میں داخل ہے۔یا ملاحت کا نام خوبصورتی رکھا جائے اگر صرف گورا رنگ خوبصورتی کے لیے کافی قرار دیا جائے تو ہرگز صحیح نہ ہوگا۔ صدہا بلکہ ہزاروں گورے رنگ والیاں خوبصورت نہیں کہی جا سکتیں۔ اور ہزاروں سیاہ رنگ اور گندم گوں ایسی ہوتی ہیں جن کو نہ صرف خوبصورت بلکہ خوبصورت ترین کہا جا سکتا ہے۔

خوبصورتی کا معیار قرار دینا مشکل ہے۔اور ہمارے خیال میں تو خوبصورتی

ہر شخص اپنے نقطہ نظر سے قرار دیتا ہے۔

جب خوبصورتی اور حسن کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا تو پھر "حسین بیوی" کس کو کہا جائے گا۔ جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے دنیا میں حسن اور خوبصورتی جس کو خوبصورتی کہا جاتے نایاب ہوتی ہے۔ اگر ناک نقشہ چہرہ مہرہ کے بے عیب ہونے کے لحاظ سے کسی کو خوبصورت قرار دے سکتے ہیں تو اور بات ہے مگر اس کو حسین نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح حسن اور خوبصورتی نایاب ہے اسی طرح کسی "خاتون کی سیرت" کا معلوم کرنا بھی دشوار ہے۔ خصوصاً ہمارے یہاں کی معاشرت میں، اور پھر جس قسم سے شادی بیاہ کا طریقہ رائج ہے اور جس طرح دُلہن کا انتخاب کیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے تو حسن سیرت کا معلوم کرنا دشوار ترین ہے۔ جب اس طرح حسن سیرت کا معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے تو کم از کم حسن صورت کا ہی خیال کیا جاتا ہے تاکہ دُلہن کم از کم دیکھنے میں تو اچھی ہو ناک و نقشہ بے عیب رہے۔ ایک اور بحث یہاں پیش ہوتی ہے کہ کیا تمام حسین اور خوبصورت عورتیں بدمزاج ہوتی ہیں؟ اور کیا تمام بدصورت عورتیں اچھی سیرت رکھتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ کلیہ قائم کر لینا نہایت ناانصافی ہے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش ہو سکتی ہیں کہ باوجود حسن صورت کے بعض عورتیں حسن سیرت سے بھی آراستہ ہیں اور اسی طرح ایسے نظائر بھی پیش کیے جا سکتے ہیں کہ بدصورتی کے ساتھ وہ اپنی بدمزاجی میں بھی شہرت رکھتی ہیں حقیقت یہ ہے

خدا پنج انگشت یکساں نہ ساخت

بدمزاجی دونوں میں ہو سکتی ہے اور حسن صورت بھی دونوں رکھ سکتی ہیں حسن سیرت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہماری موجودہ معاشرت باقی ہے۔ فقط

ہاشمی (پیام حیدرآباد)

دفتر عصمت کی چند اور مطبوعات

روحانی شادی یہ اصلاحی ڈرامہ ملک کے مشہور افسانہ نگار جناب منشی پریم چند صاحب بی۔ اے نے عصمت کے لئے لکھا تھا عصمت میں شائع ہوکر خوب مقبول ہو چکا ہے۔ اب کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ پلاٹ۔ مکالمہ۔ کیرکٹر ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ اور نتیجہ خیز اور سبق آموز ہے۔ دلچسپ اور دلاویز ہے۔ عبرت ناک بھی اور کافی تفریحی اور مزاحیہ بھی۔ اصلاح معاشرت پر اتنے موثر اور بلند پایہ مختصر ڈرامے بہت کم نکلیں گے۔ ہندی ایڈیشن کی قیمت بارہ آنے ہے۔ مگر اُردو ایڈیشن کی قیمت ۱۲/

دودھ کی قیمت منشی پریم چند آنجہانی کے افسانوں کا آخری مجموعہ جس میں ۹ افسانے نہایت دلچسپ سبق آموز اور نتیجہ خیز ہیں اور خاص طور پر عورتوں کے لئے لکھے گئے تھے۔ قیمت ایک روپیہ (عدد)

پھول پھلواری پھولوں کی کاشت۔ کیاری اور باغیچہ کی نگہداشت اور انگریزی ہندوستانی اور ہر موسم اور ہر قسم کے پھولوں کے متعلق نہایت مفید اور کارآمد معلومات۔ لڑکیوں کے لئے قابل قدر تحفہ قیمت آٹھ آنے (۸/)

دامن باغبان ہندوستان کے مشہور افسانہ نگاروں میں یہ خصوصیت ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کی تحریر میں ہے کہ وہ خشک سے خشک مضمون کو دلچسپ پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں۔ جذبات نگاری میں ڈاکٹر صاحب کو کمال حاصل ہے۔ اور زبان روزمرہ نہایت عام فہم لکھتے ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ دامن باغبان ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ نمبر ا بدنصیبن بیاہ نمبر ۲ خدا کا ہاتھی۔ نمبر ۳۔ بخار کا لنو بہ۔ نمبر ۴۔ بڑا آدمی۔ نمبر ۵۔ سکون نا آشنا دل۔ نمبر ۶ حسرت نصیب مزدور۔ نمبر ۷ حفاظت کے فرشتے۔ اس مجموعہ کے وہ دلاویز۔ نتیجہ خیز۔ سبق آموز افسانے ہیں۔ جو اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور صرف

ایک ہی افسانے کے پڑھنے سے ساری کتاب کی قیمت وصول ہوجاتی ہے۔ افسانے جس قدر دلچسپ ہیں اتنا ہی بڑھیا ولائتی کاغذ لگایا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اعلیٰ درجہ کی قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

افسانہ حرم لڑکیوں کے لیے ایک فاضل جرنلسٹ نے دس کہانیاں لکھی ہیں اور ہر کہانی سے کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ نکلتا ہے۔ لڑکیاں کتاب کو نہایت دلچسپی سے پڑھیں گی۔ طرز بیان ہیں دلاویزی ہے۔ عبارت بہت ہی آسان۔ عام ہندوستانی گھرانوں کی کیفیت نہایت خوش اسلوبی سے دکھائی گئی ہے قیمت ۸ر

پردہ و تعلیم اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ تعلیم نسواں کی طرف سے غفلت کرنے سے مسلمانوں کو کیسا شدید نقصان پہنچ چکا ہے اور اب اُن کی ترقی و بہتری کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ اس کتاب میں مسلمان عورت کا تمام مذاہب کی عورتوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور پردہ پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کا مروجہ پردہ درست نہیں۔ اس کتاب کے مضامین کی عصمت میں شائع ہوکر مقبول ہوگئی ہے۔ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے قیمت ۱۲ر

خواتین اندلس اندلس یعنی اسپین میں مسلمانوں نے ۸۰۰ سال تک جس شان سے حکومت کی ہے تاریخ سنہری الفاظ میں ہمیشہ اس کا ذکر کرے گی۔ مسلمانوں کے زمانہ میں سرزمین اندلس (اسپین) نے ایسی ایسی باکمال خواتین پیدا کی تھیں جنہوں نے علوم و فنون کے دریا بہا دیئے تھے۔ محترمہ مہرالنساء صاحبہ نے بہت سی کتابوں سے بڑی تلاش و جستجو اور بے حد محنت و جانکاہی سے ان خواتین کے حالات اخذ کرکے نہایت دلچسپ پیرایہ میں لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں طبقہ نسواں کیسی کیسی اعلیٰ پایہ کی شاعر ادیب مصور بذلہ سنج لطیفہ گو حاضر جواب خواتین رکھتا تھا۔ قیمت ۲ر

آفتاب زندگی زنانہ لسنہ جیسی مفید اور قابل قدر کتاب کے مصنف مولانا سیماب اکبرآبادی نے اس دلچسپ قصہ میں ایک لڑکی کے کنوارپنے کے حالات دلنشین پیرایہ میں لکھے ہیں اور فضول اور نقصان دہ رسموں پر مدلل بحث کی ہے۔ واقعات دلاویز اور طرز بیان دلکش ہے۔ خاص طور پر مستورات کے لئے

لکھا گیا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی اوسط درجہ کی (۸ر)

شباب زندگی آفتاب زندگی کا دوسرا حصہ ہے جس میں شمس النساء کی شادی سے اس وقت تک کے حالات درج ہیں۔ جب وہ بال بچوں والی ہو گئی۔ اس ضمن میں جو مصائب اور جو تکلیفیں، جو آرام اور جو راحتیں اُٹھائیں اور جو تجربے اس نے حاصل کئے وہ سننے اور پڑھنے اور گرہ میں باندھ لینے کے قابل ہیں۔

آفتاب زندگی کی اشاعت نے ملک میں ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ اور ضرورت مندوں کے تقاضوں کے بعد اس کا دوسرا حصہ بھی لکھوایا ہے۔ شباب زندگی میں مندرجہ ذیل باتوں پر مفصل ذیل بحث کی گئی ہے۔ اور ہر بحث سے ایک دلچسپ اور مفید نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) انتخاب شوہر (۲) حقوق شوہر (۳) ازدواجی زندگی (۴) سسرال والوں کا برتاؤ۔ (۵) خوشنودی شوہر (۶) عیالداری (۷) بچوں کی تربیت (۸) نند بھاوجوں کے ساتھ تعلقات وغیرہ وغیرہ۔ زبان سلیس۔ عبارت عام فہم۔ لکھائی چھپائی صاف۔ کاغذ چکنا قیمت ۸ر

زنانہ لبستہ دس ننھی ننھی کتابوں کا مجموعہ (۱) بسم اللہ کی کتاب (۲) کہانیوں کی کتاب (۳) کھیل کی کتاب (۴) لکھنے کی کتاب (۵) نماز کی کتاب (۶) کھانے پکانے کی کتاب (۷) تندرستی کی کتاب (۸) تہذیب ادب اور اخلاق کی کتاب (۹) پردہ کی کتاب (۱۰) خانہ داری کی کتاب یا دلہن کا جہیز۔ جو کتاب جس مضمون پر ہے مکمل ہے بچیوں اور لڑکیوں کے لئے زنانہ لبستہ نہایت ہی مفید اور بڑے کام کی کتاب ہے۔ اور دلچسپ اتنی ہے کہ وہ خوشی خوشی اور اپنے شوق سے بار بار پڑھتی ہیں۔ مقبولیت کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ چوتھی دفعہ چھپی ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

تمام کتابیں ملنے کا پتہ:۔ دفتر عصمت دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

عصمت بک ڈپو دہلی

ہندوستان بھر میں سب سے بڑا زنانہ کتب خانہ

...ھانے پکانے کی کتابیں

- ...مستی دستر خوان عا/
- ...شرقی مغربی کھانے عا/
- ...متی ہنڈ کلیا ۸/
- ...شتہ ۱۰/
- ...دں کے کھانے ۸/
- ...باردں کے کھانے ۱۰/
- ...اقبہ کھانے ۶/

...انہ دستکاری کی کتب

- ...متی کروشیا عہ۸/
- ...متی کشیدہ عہ/
- ...دستہ کشیدہ عہ۸/
- ...نی کا کام عہ۸/
- ...تیوں کا کام عا/
- ...مہ ستارہ کا کام عا/
- ...نی کام سلائیوں سے عہ۸/
- ...الی کا کام عہ۸/
- ...رکشی کا کام عہ/
- ...ظلا ستہ تار کشی عہ۸/
- ...راس اسٹیچ ورک عہ۸/
- ...ہرلنسواں راشد الخیری نمبر عہ/
- ...نیم سوزن کاری عہ۸/
- ...اتین کی دستکاریاں ۸/
- ...ی کا باریک کام ۸/
- ...ملی کا کام ۸/

...ند دلچسپ زنانہ کتب

- ...دہ تعلیم ۱۲/
- ...اتین اندلس ۶/
- ...مایان نسواں ۱۲/

تصانیف محترمہ خاتون اکرم مرحومہ

- جمال ہمنشیں عہ/
- گلستان خاتون عہ۴/
- پیکر وفا ۸/
- بچھڑی بیٹی ۶/

تصانیف محترمہ صغرا ہمایوں مرزا

- مشیر نسواں یا زہرہ عہ۴/
- تحریر النسا ۱۲/
- سرگذشت ہاجرہ ۱۰/
- موہنی ۱۰/

تصانیف محترمہ ملقبیس بیگم اودا

- خانہ داری کے تجربات ۱۲/
- سفید نسواں ۸/

تصانیف محترمہ حجاب اسمٰعیل

- ادب زریں ۸/
- نغمات موت ۶/

دیگر تصانیف محترمہ آمنہ نازلی

- دولت پر قربانیاں ۸/
- تاریخی لطیفے ۸/
- عقل کی باتیں ۸/
- ہنسی کی باتیں ۸/

زنانہ نظمیں

- شمع خاموش ۶/
- آئینہ جمال ۱۲/

زنانہ افسانے و گیت

- افسانہ حرم ۷/
- دامن باغباں عہ/
- دیہاتی گیت ۱۲/

تصانیف منشی پریم چند

- دودھ کی قیمت عہ/
- روحانی شادی ۶/

تصانیف مولانا سیماب

- زنانہ لستہ [illegible]
- آفتاب زندگی ۶/
- شباب زندگی ۶/

عورتوں کی خاص کتب

- زچہ خانہ (دو حصے) [illegible]
- سنگھار خانہ [illegible]

نامور خواتین کے افسانے

- انوری بیگم عہ۶/
- جہاں بانو ۱۲/
- غیرت کی پتلی ۶/
- شہید وفا عہ/
- چاند رخ ۴/
- فیروزہ ۸/

کچھ اور مفید کتابیں

- صنعت و حرفت عا/
- تندرستی ہزار نعمت ۴/
- بچوں کی تربیت ۱۰/
- آشیانہ موسٹر عہ۸/
- پھول پھلواری ۸/

بچوں کی کتب

- جاپانی کہانیاں عہ/
- مزیدار کہانیاں ۵/
- بچوں کی دنیا ۷/
- مختصر دنیا ۵/
- شہزادی نیلوفر ۱۲/

یادگار مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

رسالہ عصمت دہلی

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ اخبارات و رسائل میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ چھپنے والا مشہور و معروف بالتصویر ماہوار رسالہ ۳۰ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ عصمت ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کے اعلیٰ درجہ کے مضامین ۸۰ صفحوں پر ہر ماہ شائع کرتا ہے عصمت ہی وہ رسالہ ہے جو صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے شریف بیگمات کے لئے ہندوستان کا چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا ہے۔

سالانہ چندہ چار روپیہ (للعہ/)

رسالہ بنات دہلی

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے ۱۹۲۷ء میں یہ ماہوار رسالہ مسلمان لڑکیوں کے لئے جاری فرمایا تھا دس سال میں اس کا کسی ایک ماہ کا پرچہ بھی ایک دن کی تاخیر سے شائع نہیں ہوا عصمت کی طرح بنات بھی پابند وقت ہے۔ لڑکیوں اور بچیوں کے لئے بہترین مضامین سبق آموز نظمیں مزیدار کہانیاں شائع کرتا ہے زبان اتنی آسان کہ گیارہ برس تک کی بچیاں سمجھ سکتی ہیں۔ سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ

نمونہ مفت

فخر نسوان ہند محترمہ خاتون اکرم کی یادگار

جوہر نسواں دہلی

ہندوستان بھر میں زنانہ دستکاری کا واحد رسالہ ہے جس میں کشیدہ کروشیا جالی تارکشی کارپٹ کینوس کراس اسٹچ سلمہ ستارہ زری پٹی کٹاؤ اور کپڑوں کی سلائی کٹائی وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور ہدایتیں شائع ہوتی ہیں جوہر نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں جوہر نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں

سالانہ چندہ مع محصول عہ/ فی پرچہ ۴/

منیجر عصمت و بنات دہلی

۱۱۵
(خ ن)
۹۲۰.۶۷

DUE DATE

T06.05.00

Ram Babu Saksena Collection.

۳۳۰۸۹

۱۱۱۸ (ق۲) ۹۲۰.۵۲

۳۳،۸۹

ہاشمی، نصیر الدین

خیابانِ سنوران –

Date	No.	Date	No.
T06.05.00			